2024-25 میں لکھی جانے والی نثر اور شاعری

یا صاحبی السجن

یارانِ زِنداں

پروفیسر اطلس علی

تلاش نامے ہیں اپنے ہم زادوں کے لئے



حرفِ آغاز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ
تمام قارئینِ ذی وقار کو آدابِ دل و جان!

زیرِ نظر کتاب یا" صاحبی السجن " (اے میرے! قید خانے کے رفیقو) محترمی و مکرمی جناب پروفیسر اطلس علی صاحب کی خوش ذوق، خوش فہم اور خوش نوا تحریری کا ثمرِ شیریں ہے۔ یہ تصنیف افسانوی رنگ میں فکرو احساس کے وہ چراغ روشن کرتی ہے جو کبھی ذات کی گہرائیوں میں اترتے ہیں، کبھی سماج کے آئینے میں عکس بن کر ابھرتے ہیں، کبھی حادثاتِ روزگار کی تلخیوں کو لفظوں میں سمو دیتے ہیں اور کبھی عالمی سیاسی منظرنامے کی دھند میں معنویت کی لکیر کھینچ دیتے ہیں۔ کہیں تمثیل کی اوٹ میں حکمت بولتی ہے اور کہیں اپ بیتی کے پیرائے میں جگ بیتی کی صدا سنائی دیتی ہے۔

اس کتاب کی سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ زبان نہ پیچیدہ ہے نہ ثقیل، بلکہ سلیس، عام فہم اور فصیح ہے؛ ایسی رواں کہ قاری کے قدم کہیں اٹکتے نہیں، اور ایسی شگفتہ کہ دل اکتاتا نہیں۔ مختلف اور دلکش موضوعات ایک ہی جلد میں اس سلیقے سے سمٹ آئے ہیں کہ کثرت میں وحدت اور اختصار میں جامعیت کا حسن نمایاں ہو جاتا ہے۔ اس میں شامل سبق آموز حکایات معاشرے کی اصلاح و سدھار میں مدد و معاون ہیں اور افسانے مختصر ہو کر بھی معنی کے دریا بہا لے جاتے ہیں—گویا کم لفظوں میں زیادہ بات، اور سادہ اسلوب میں گہرا اثر۔

میری مخلصانہ گزارش ہے کہ جن حضرات کو یہ کتاب میسر آئے، وہ اسے ضرور زیرِ مطالعہ لائیں؛ کہ یہ محض مطالعہ نہیں، تجربہ ہے۔

محض تفریح نہیں، تربیت ہے۔ دعا ہے کہ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ پروفیسر صاحب کے قلم کو مزید زور، فکر کو مزید نور اور بیان کو مزید اثر عطا فرمائے۔ یہ اگرچہ ان کی پہلی کوشش ہے، مگر امیدِ واثق ہے کہ آئندہ بھی ان کی طرف سے جذبہ افروز تصانیف صفحۂ قرطاس پر جلوہ گر ہوتی رہیں گی اور اہلِ ذوق کے لیے سرمایۂ مسرت بنتی رہیں گی۔

فقط دعا گو
ابو ہانی العلوی
17 جنوری ، 2026

مصنف کا تعارف

ہم مئی ، 1999 میں ضلع کے دور دراز قصبے میں پیدا ہوئے ۔ وہاں سے ہجرت کرکے ہم جڑانوالہ ضلع فیصل آباد منتقل ہو گئے اور ابتدائی تعلیم کا آغاز وہیں سے ہوا ۔
پرائمری تعلیم گاؤں سے ہی حاصل کرنے کے بعد میٹرک تک تعلیم گورنمنٹ گرو نانک ہائی اسکول ننکانہ سے حاصل کی اور انٹر میڈیٹ گورنمنٹ کالج شاہکوٹ سے کیا ۔ جہاں مجھے علی آصف جیسے پروفیسرز ملے جنہوں نے ملے ادب سے روشناس کروایا اور مجھے لکھنے کی طرف مائل کیا ۔ اندھیری غار میں روشنی کی پہلی کرن بڑی سود رس ہوتی ہے ۔ مرتے ہوئے شخص کو آخری خوشی ملنا تمام زندا لوگوں کی پوری زندگی کی خوشیوں کا نعم البدل ہوتا ہے ۔

پرائمری اسکول سے ہمیں جو استاتذہ ملے ان میں سے ہر دلعزیز شخصیت تھے سر ارشد علی صاحب جو کہ جب تفریح کا وقت ہوتا تو اسکول کی مختصر سی لائبریری سے چند چھوٹی چھوٹی کتابیں نکالتے اور بچوں کو ساتھ بٹھا کر انہیں کہانیاں سناتے ۔
اور وہیں سے مجھے کتب بنی کا شوق پیدا ہوا ۔ جو اب میری خون میں شکر بن کر گردش کر رہا ہے ۔
کتب کے مطالعہ سے ذہنی وسعتوں اور خیالات میں جو طوفان برپا ہوتے ہیں ۔ ان کو اگر منہ نا ملے تو وہ انسان کو اندر سے جھلسا کر رکھ دیتے ہیں ۔

اور ان طوفانوں کو راستہ دینے کا اور ان سے مثبت نتائج لینے کا
درست طریقہ یہی ہوتا ہے کہ
آپ قلم کو اپنا ساتھی بنا لیں ۔
ہم نے یہی کیا ۔
ہم نے اس مجموعہ کو کسی صورت بھی ایک کامل لکھاری کی طرح سے قلمبند نہیں کیا بلکہ اسے ہماری ایک بے باک جسارت سمجھیں اور سورج کو چراغ دکھانے کی مانند جانیں ۔

اسے وہ قید خانے میں موجود پھانسی کا انتظار کرتے قیدی کی کٹی ہوئی انگلیوں سے دیواروں پر لکھی جانے والی آخری تحریریں سمجھیں ۔
یہ میرے زندہ رہنے کی کوشش ہیں یہ میری بقا کی جنگ ہے ۔
میرے اندر مچلتے ہوئے طوفانوں کی ایک جھلک ہے ۔
جن کی کوئی صورت نہیں بن پا رہی کہ میں انہیں مروجہ الفاظوں کہ مالا پہنا کر
لوگوں کے روبرو لا سکوں ۔
ایک اپنی سی کوشش سمجھیں ۔ اور اس پر کھلے دل سے مثبت تبصرہ و تنقید کریں ۔

پروفیسر اطلس علی

29-12-2025
0316-4133009

" جو لکھا تپاکِ جاں سے لکھا "

اصل میں رونا ہے کس بات کا ؟

4 مئی کو ابو سیڑھیوں سے گر گئے منہ اور کانوں سے خون نکلنے لگا ۔
پچھلے سال ایک سائیڈ پر فالج کا حملہ ہوا تھا تو ایک سائیڈ اچھے سے حرکت نہیں کرتی تھی ۔
ریسکیو کو بلایا گیا ۔ چونکہ میں بذات خود تو موجود نہیں تھا وہاں مصدقہ اطلاعات کے مطابق یہی صورت حال موصول ہوئی ۔

میں سوچنے لگا کہ جب ہمارا کوئی پیارا اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو ہم روتے ہیں ۔
کوئی عزیز پیدا ہوتا ہے تو ہم خوش ہوتے ہیں
جبکہ تب بھی وہ ایک عالم سے رخصت ہوکر اس عالم دنیا میں آتا ہے ۔
پھر یہاں اپنی مقررہ مدت گزارتا ہے اور اگلے عالم یعنی عالم برزخ میں چلا جاتا ہے بوقت قیامت تک

اب ہم روتے کیوں ہیں ؟
ویسے تو یہ فطری عمل ہے انسان تو کیا دوسری مخلوقات بھی اپنے پیاروں سے انس رکھتی ہیں ۔ اور بچھڑنے پر غمگین ہوتی ہیں ۔
تو یہاں ہمارا غم خاص کر والدین کے رخصت ہونے پر اس کی نوعیت کیا ہوتی ہے ۔
یا تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ جنہیں ہم بچپن سے دیکھتے آئے ہیں سرد گرم ان کے ساتھ بیتا ہے ۔ ان کی تکلیف ہماری تکلیف رہی ہے اور ہماری تکلیف ان کی تکلیف
مگر اب یہ بے جان جسم کی طرح پڑے ہیں ۔ اور ہم خود انہیں لیجا کر ایک زمین میں کھودے گھڑے میں ڈالیں گے اور اوپر سے مٹی ڈال دیں گے ۔
ہم چاہتے ہوئے بھی وہاں اندر ان کے ساتھ نہیں جا سکتے یا انہیں زندہ نہیں کر سکتا اور نا ہی ان کا جسم گھر میں حنوط کرکے رکھ سکتے ہیں ۔

یعنی ہم روتے ہیں اپنے بے بسی پر
یا پھر ہم روتے ہیں کہ جب یہ ہماری آنکھوں کے سامنے جو ان کے ساتھ ہوا یا ہم نے کیا
وہی ہمارے خود کے ساتھ بھی ہوگا ۔ اور ہم کچھ نہیں کر سکیں گے ۔ اپنے انجام کو سوچ کر روتے ہیں ۔
مگر ہو سکتا ہے ہم روتے ہوں اپنی شرمندگی کی وجہ سے کہ ہم ان کی زندگیوں میں ان کے ساتھ جو سلوک کرنا چاہیے تھا ۔
جو ان کا حق تھا ہم پر ، ہم انہیں ویسے ادا نہیں کر پائے
اپنی لاپرواہی یا محرومیوں کے وجہ سے
کچھ بھی وجہ ہو سکتی ہے
کیا ہم اس وجہ سے روتے ہیں ؟؟
مجھے اس چیز کا تجربہ نہیں ہے ۔
مجھے نہیں معلوم کہ کیا ہوتا ہے یا کیسی کیفیت ہوتی ہے ۔
میرا مسئلہ ہے کہ میں زندوں پر زیادہ رونے کا عادی ہوں ۔
میں جتنا یاد کر سکتا ہوں مجھے یاد ہے کہ میں زندوں پر زیادہ رویا ہوں گزرے ہوئے لوگوں پر بھی روتا ہوں ۔
خاص کر جب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کو دیکھتا ہوں سنتا ہوں یا پڑتا ہوں ۔
مجھے بہت رونا آتا ہے ۔ میں ان کے علاوہ کسی کے متعلق تصور کرنے پر میں روتا نہیں ہوں ۔

مگر شاید یہ بھی انہی محرومیوں میں تصور ہوگی بات کہ جو اپنے بس میں نہیں ہے ۔ ان سے ملنا ، اس وقت میں پہنچنا ، اتنے قریب سے دیکھنا جتنا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین دیکھتے تھے ۔
دنیا کے سب سے کامل انسان کو ۔
ہم ادھوروں کو کاملیت کی ہی کشش ہوگی نا ۔
میرے تصور میں وہ چھ سال کا بچہ آتا ہے جس کی ماں دوران سفر فوت ہو گئیں ہیں اور وہ اپنی ماں کی قبر سے لپٹ لپٹ کر رو رہے ہیں سیاہ فام لونڈی ام ایمن انہیں پکڑتی ہیں سینے سے لگاتی ہیں دلاسہ دیتی ہیں مگر خود بھی آبدیدہ ہیں ۔ وہ سیاہ سنگلاخ پہاڑوں کے بیچ چھ سال کا بچہ جس نے کبھی اپنے باپ کو نہیں دیکھا ۔ اس کے سامنے اس کی ماں بھی اب صرف پتھروں کی ڈھیری نظر آ رہی ہیں ۔
اس بچے کی ذہنی کیفیات کا اندازہ لگانا مشکل ہے ۔ مگر انہیں جس منصب کے لیے تیار کیا جا رہا ہے وہ اتنا بڑا منصب ہے کہ ان سنگلاخ چٹانوں میں یہ سہن کرنا ہی پڑا ۔
اس قدر غم ہیں گنوانے لگے تو گنوا نا سکیں ۔
13-05-2025

محبت کے داعی محبت سے خائف

سال ڈیڑھ پہلے کی بات ہے میری خالہ ہے بیٹے کی شادی میری پھوپھو کی بیٹی سے طے پائی ۔
کچھ عرصہ منگنی رہی اور پھر نکاح کردیا
مگر
رخصتی نہیں کی گئی ۔ لڑکے نے سعودیہ میں جینٹس سیلون کی دوکان بنائی ہوئی تھی ۔
اب مسئلہ یہ درپیش تھا کہ پھوپھو کہ بیٹی اس رشتے سے خوش نہیں تھی اور اس کا اظہار برملا وہ اپنے والدین کے سامنے کر چکی تھی ۔ دو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی ۔ بھائی اس سے چھوٹے تھے اور وہ بڑی ۔
جس لڑکے سے وہ خود کرنا چاہتی تھی وہ دبئی میں کام کرتا تھا ۔ اور قریب ہی میں کہیں رہتا تھا پاکستان میں ۔

گھر والوں نے اس کی نہیں سنی اور رشتے کو برقرار رکھا ۔
یہاں تک اس نے والدین سے کہا کہ میں نے اس سے نکاح کر لیا ہے ۔ مگر گھر والوں نے اس بات کو بھی نظر انداز کیا اور اس کا نکاح کردیا ۔
اب نکاح کے بعد جب رخصتی کے دن قریب آئے اور بارات جس دن جانی تھی اس سے ایک دن قبل
لڑکی گھر سے چلی گئی ۔

لڑکی والوں نے لڑکے والوں کو پہلے ہی سے لڑکی کی ناپسندیدگی کا بتایا ہوا تھا ۔ اس لئے اس موجودہ صورتحال میں لڑکی والوں نے لڑکے والوں کو اطلاع دی اور بڑوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ لڑکی والوں کے قریبی جو کہ پھوپھو کہ طرف سے کسی اور لڑکی سے نکاح کردیا ۔
اس بات کو وقت گزرتا رہا ۔ کسی سے رابطہ نہیں ہوا لڑکی کا اور نا ہی کوئی خبر ملی کہ کہاں ہے ؟؟کیسی ہے ؟؟

درمیان میں یہ معلوم ہوا کہ بچہ ہوا ہے ۔
مجھے چند ماہ سے بڑی شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ میں کسی طرح سے اس کے حال سے آگاہ ہو جاؤں کہ وہ کیسی ہے ۔
سامنے بچی تھی بڑی ہوئی ۔ اور میں اس کی اس اقدام کا زمہ دار بھی اس کے والدین کو سمجھتا ہوں جنھوں نے جانتے ہوئے بھی کہ وہ رشتے سے خوش نہیں اس کی زبردستی شادی کرنا چاہی ۔
یقیناً وہ اس کی بھلائی کے خواہاں تھے مگر بھلائی ہو نا سکی ۔
ابھی چند دن پہلے کسی رشتہ دار سے اطلاع ملی کہ جس لڑکے کے ساتھ وہ گئی تھی اس نے اسے چھوڑ دیا ۔ پھر وہ کسی سہیلی کے ساتھ رہتی رہی اور اس سہیلی نے اس کا کہیں اور نکاح کردیا ہے ۔
بچہ اس کے ساتھ ہی ہے ۔

اب یہاں ذہن دو راہے پہ کھڑا ہو جاتا ہے
کیا درست ہے اور کیا غلط
کسی لڑکے کو پسند کرنا غلط تھا ؟؟
والدین کا اس میں تعاون نا کرنا غلط تھا ؟؟
اس کا گھر سے جانا غلط تھا ؟؟
یا اس لڑکے کا اسے چھوڑ دینا غلط ہے ؟؟
مجھے غیرت کے نام پر ہونے والے قتل بلکل پسند نہیں ہیں ۔
مگر ایسے مرد کو قتل کرنا چاہیے ۔ تاکہ وہ عبرت کا نشان بنے ۔
جب نبھا نہیں سکتا ہے تو کسی کو جھوٹے خواب کیوں دکھاتا ہے ؟
اور یہاں پہنچ کر محبت کے داعی محبت سے خائف ہونے لگتے ہیں ۔
میں نے اس لئے بھی ارینج میرج کی کہ ہو سکتا ہے جسے میں پسند کرکے لاؤں اس کی قدر ویسے نا کر سکوں جو اس کا حق ہو ۔
اور وہ اس محرومی کو جینیٹیکلی نسلوں میں منتقل کردے ۔ اسے کوئی پھر کبھی یقین نہیں دلا سکے گا کہ محبت بھی کچھ ہوتی ہے ۔
14-05-2025

جمہور ہوئے جمود

جمہوریت ، جمہور کی آواز ہے یعنی اکثریت کا فیصلہ ۔
ہمارے ہاں جو جمہوری نظام رائج ہے اس میں حکومتی مدت 5 سال مقرر کی گئی ہے ۔
یعنی کہ 5 سال بعد ہم کسی بھی پارٹی جو صاحب اقتدار رہی ہو یا اقتدار چاہتی ہو
اس کی کارکردگی ہے مطابق منتخب کریں اور اسے اقتدار کی کرسی پر بیٹھا دیں ۔
مگر
کیا ہم ان پارٹیوں کے اور پر نگران ہیں یا پھر ان کے وکیل ؟؟

ہمارے معاشرے کی یہ کم عقلی و کج فہمی سمجھیے کہ
وہ جس بھی پارٹی جو پسند کرتے ہیں اس کے منشور اور اس کے ملکی معاملات کو چلانے کے لائحہ عمل کو پسند کرتے ہیں
اگر وہ اس سب دعووں میں کامیاب نا ہو رہی ہو تو تب بھی ہم اس کے وکیل بنیں رہتے ہیں
ساتھ طرح طرح کی تاویلات گھڑتے ہیں اس کی ناکامیوں کو چھپانے کے لئے ۔
جبکہ جمہوریت میں یہ وطیرہ ہوتا ہی نہیں ہے
جمہوریت میں تو ہم نگرانی کرتے ہیں ان نمائندگان کی جو منتخب ہوکر ایوانِ بالا میں یا ایوان زیریں میں پہنچتے ہیں ۔

ووٹرز کو پھر دیکھنا ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے جو دعوے کیے تھے کیا وہ ان کو پورا کرتے ہیں
یا نہیں کرتے
اور اگر وہ نہیں ان وعدوں کو پورا کرتے تو پھر ہم ان منتخب نمائندوں کو پوچھنے کے اہل ہیں اور وہ جواب دینے کے ۔

تاکہ وہ عوام کو اپنے ذاتی مقاصد کے لیے استعمال کریں ۔

مگر ہمارے ہاں کیا ہوتا ہے ۔
لوگ اپنے ہی منتخب نمائندوں پر کڑی تنقیدی نظر رکھنے کے بجائے
ان کے وکیل بن جاتے ہیں ۔ اپنے حقوق کو سلب کروانے لگتے ہیں اور وہی نمائندگان کو اس لئے منتخب کیا گیا تھا کہ وہ عوامی مفادات کا دفاع کریں گے وہی ان عوامی مفادات کو غصب کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھنے لگتے ہیں ۔

ریاست چاہے کسی عسکری قیادت کے پاس ہو ، مذہبی یا ڈیموکریٹس کے پاس
آواز جمہور ہی کہ بلند رہتی ہے ۔
چہ جائیکہ جمہور ہی جمود کا شکار ہوکر خود اپنے ہاتھوں سے اپنے حقوق سلب کرنے کا موقع فراہم کردیں ۔
ہم کسی سیاسی جماعت سے وابستگی اختیار کرتے ہیں تو اس میں بنیادی وجہ ہوتا ہے اس جماعت کا منشور اس کی پالیسیز اب وہ درست ہیں یا غلط ہیں اس پر معلوم ہوگا ناقدین کی رائے سے ۔
لیکن
اگر ہم ناقدین کو دشمن ریاست تصور کرنے لگ جائیں تو یہ ایک وبائی مرض کی عوامی ذہنوں کو کھا جاتا ہے ۔

ہمارے منتخب نمائندے ہمیں جوابدے ہیں ۔ اگر وہ اپنے دعوؤں اور الیکشن کمپین میں دکھائے سبز باغوں کو شرمندہ تعبیر نا کریں ۔ تو انتخاب درست کر لیں ۔ بار بار دھوکا کھانے کی بجائے ۔

18-05-2025

بطورایجنٹ(TheSpy)

یہ کہانی ہے ایک اسرائیلی جاسوس ایلی کوہن کے جاسوسی کرئیر پر فلمائی گئی ہے ۔
اس میں بنیادی کردار سچا بورن کوہن نے ادا کیا ہے جو اس سے پہلے ہم ڈکٹیٹر نامی فلم میں بھی دیکھ چکے ہیں ۔
یہ فلم ایلی کوہن کے 1961 سے 1965 تک چار سالوں کا احاطہ کرتی ہے ۔
کہ کس طرح بڑی مہارت سے اور تیزی سے ایلی شامی حکومت سے اپنے تعلقات کو استوار کرتا ہے ۔
ایک سفیر سے شروع ہوکر شام میں پوری شامی حکومت کو ختم کرکے نئی حکومت کے قیام میں شامی سفیر امین الحافظ کی مدد کرتا ہے ۔
یہاں تک کہ وہ دفاعی سیکرٹری جنرل کے عہدے تک پہنچ جاتا ہے ان چار سالوں میں ۔
پھر 1965 میں روسی ریڈیو سگنلز میں گڑبڑ پیدا ہوتی ہے اور وہ اس کو شامی حکومت تک پہنچاتے ہیں کہ آپ کے ایریا سے ایک مخصوص وقت میں ریڈیو سگنلز ٹرانسمت کئے جاتے ہیں
جب اس پر تحقیقات کی جاتی ہیں تو شامی سکیورٹی فورسز ایلی کوہن کے گھر تک پہنچ جاتی ہیں اور ایک صبح جب وہ سگنلز ٹرانسمت کر رہا ہوتا ہے ۔ اسے پکڑ لیتی ہیں ۔
شامی صدر اسے سزائے موت سناتا ہے اور دمشق میں سرعام 18 مئی 1965 کو اسے پھانسی دے دی جاتی ہے ۔

ہم نے اکثر جیمز بانڈ سیریز میں دیکھا ہوگا سیکرٹ ایجنٹ ہے اور وہ اچھے سوٹ بوٹ میں رہتا ہے ، ایکشن کرتا ہے ، بے دریغ پیسہ استعمال کرتا ہے ، اور ضرورت پڑنے پر سیکس بھی کرتا ہے ۔
مگر اس ظاہرہ شان و شوکت کے ساتھ ساتھ ایک جاسوس ایسے حالات سے دو چار ہوتا ہے ۔ جن کا اندازہ کوئی عام شخص نہیں کر سکتا ۔ اور صرف وہی نہیں اس سے گزرتے بلکہ اس کے ساتھ اس کے بیوی بچے یا والدین بھی اس سب سے گزرتے ہیں ۔

جاسوس اپنی ذات کو ،ذاتی زندگی کو ، گھر والوں کو یہاں تک کہ اپنے مذہب و ملک کو بھی ترک کرکے ایک الگ اور نئی شخصیت کے طور پر خود کو ڈھالتا ہے ۔
کسی دشمن ملک میں رہتے ہوئے ہر وقت اس بات کا اندیشہ ہوتا ہے کہ ایک ذرا سی غلطی اسے موت سے بدتر دشمن کے ذہنی و جسمانی ٹارچر سیل میں پہنچا سکتی ہے ۔
اس مختصر سیریز میں مجھے سب سے زیادہ ایلی کوہن کی بیوی نادیہ کوہن کو دیکھ کر دلی دکھ ہوا ۔ وہ جس کرب سے گزرتی ہے ۔ ایک 8 سے 5 نوکری کرنے والا شوہر اچانک سے اسرائیلی موساد کا ایجنٹ بنتا ہے اور بغیر بتائے کہ کب لوٹے گا ۔
چلا جاتا ہے ۔
اور وہ کچھ دن بعد محسوس کرتی ہے کہ اسے حمل ٹھہر گیا ہے ۔ اس کے ساتھ اسے اور ایلی کی یاد آنے لگتی ہے وہاں ایلی ، نادیہ کو یاد کر کے خط لکھ لکھ کر پاس رکھ رہا ہوتا ہے ۔ جس پر اس کی سینئیر اسے ڈانٹتی ہے کہ یہ حرکت تمہاری جان بھی جانے کا سبب بن سکتی ہے اگر شامی پولیس نے یہاں تلاشی لی ۔کیونکہ تم جس کردار کامل امین الثابت میں ہو یہ کنوارہ امیر بزنس مین ہے ۔
دوسری طرف نادیہ کوہن اداسی اور پریشانی میں دوران حمل ذہنی تناؤ کا شکار رہتی کہ معلوم نہیں کہاں ہے ایلی اور کیا کرتا ہے ۔
کئی کئی ماہ گھر نہیں آتا ۔

ایک جاسوس کی زندگی اسراروں سے پر ہوتی ہے ۔ اور اگر وہ بد قسمتی سے پکڑا جائے تو وہی زندگی موت سے بدتر بنا دی جاتی ہے ۔
زیر زمین ٹارچر سیلوں میں ان پر نفسیاتی و جسمانی ہر طرح کا ٹارچر کیا جاتا ہے ۔
سونے نا دینا
گندگی والی جگہ پر رکھنا
اندھیرے میں تنہائی میں رکھنا

عزیز و اقارب کو مارنے یا تذلیل کرنے کی دھمکیاں دینا

مذہبی جذبات کو مجروح کرنا
یا پھر جسمانی ٹارچر
جسم کے نرم حصوں پر مارنا
اجتماعی طور پر جنسی زیادتی کا نشانہ بنانا
کرنٹ لگانا
ناخن اور دانت اکھاڑنا
جسم پر بلیڈ سے کٹ لگا کر ان میں جلنے والے کیمیکلز ڈالنا

یعنی انسان اگر زندہ بچ بھی جائے تو لاش ہی لگے ۔
یہ سیریز بڑی عمدہ ہے ضرور دیکھنی چاہیے
سپاہی چاہے کسی بھی ملک کا ہو سپاہی ہی ہوتا ہے
اس کی فیملی ہوتی ہے جو اس کا انتظار کر رہی ہوتی ہے ۔
23-05-2025

آخری ہچکی

سب آوازیں مدھم ہو چکی تھی
اور اردگرد کی تمام اشیاء اپنی صورتیں بگاڑ چکی تھی ۔
کچھ بولتے لفظوں کی سمجھ آتی کچھ کی نہیں آتی تھی
یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کہ بہت سے لوگ بھاگ رہے ہیں یا چیخ رہے ہیں
مگر یہ سب کچھ مکمل پراسس ہوتا میرے ذہن تک پہنچتا اس سے پہلے ہی
مجھے اپنے پیر بے جان ہوکر اوپر ہوا میں بلند ہوتے محسوس ہوئے ۔
کمرے کی چھت تو کیا نظر آتی مجھے تمام منظر اور آوازیں تک آنا بند ہو گئیں تھی
کوئی تاحد نظر مجھے وہی نظر آ رہے تھے اور بڑے واقع طور پر بلند ان کے پر ، جسم چہرہ سب ایسی روشنی سے منور تھے جس نے میرے بچپن سے لیکر جوانی تک کی تمام زندگی کو روز روشن کی طرح عیاں کر میرے سامنے سے گزار دیا ۔

وہ ملک الموت تھا
اس کے جسم سے پانی کے قطرے ٹپکا رہے تھے جیسے کہ وہ کسی ایسی پانی کے حوض سے ڈبکی لگا کر نکلا ہو

میں نے خود کو اس کے ساتھ کھڑا پایا اور میرا جسم سفید روشنی کا منبہ لگ رہا تھا ۔
سامنے گولی چلنے بعد باقی بچے خالی خول کے جیسے جسم پڑا تھا ۔
اس کے بعد اردگرد کے تمام مناظر پھر سے ظاہر ہونے لگے ۔
لوگ نظر آنے لگے ۔ جن میں سے
کوئی بے یقینی سے میرے جسم کو تھپک تھپک کر سعی لا حاصل کر رہا تھا ۔
شاید وہ خالی کارتوس میں کسی چنگاری کی رمق باقی ہو ۔

کوئی پر یقین تھا کہ تیر کمان سے نکل چکا ہے اور وہ باقی بچا ہوا سرمایہ سمیٹ رہا تھا یعنی میرا منہ اور پیروں کے انگھوٹھے باندھ رہا تھا ۔
شاید اسے شک تھا کہ اس جھوٹے کے پاؤں نا باندھیں جائیں گے تو یہ جھوٹ نہیں بول سکے گا ۔
میری کو بچوں کی ہوش نہیں تھی کہ کہاں ہیں کیسے ہیں ۔
وہ بس میرے ارد گرد منڈلا رہی تھی ۔ اور مجھے یہ پہلا دکھ ہوا کہ یہ منظر دیکھنے کے لیے تو میں اتنے سال جیا کچھ منٹ اور جی لیتا ۔
دوسرا دکھ مجھے میری ماں کو دیکھ کر ہو رہا تھا ۔
اس کے جسم کا ایک حصہ کٹ کر چارپائی پر پڑا تھا ۔
بے جان ، بے سدھ ، بے مروت ۔
ایک وقت ہوتا ہے جب ماں کے رحم سے الگ ہوکر خون میں لت پت نوزائیدہ بچہ بے انتہا تکلیف کے بعد جب اس کی آنکھوں کے سامنے لایا جاتا ہے تو وہ خوش ہو جاتی ہے اپنی تمام 9 ماہ کی تکالیف کو بھول جاتی ہے ۔
اور اگر وہی بچہ اس سے لے لیا جائے تو وہ رنجیدہ ہو جاتی ہے ۔
ماں کا دکھ سب سے بڑا ہے ۔ خود جائے تو اولاد کے لیے اور اولاد چلی جائے تو ماں کے لئے ۔
درمیان میں فالج زدہ باپ کی بھی بے ترتیب اور ادھوری ہچکیاں سنائی دے رہی تھی
میں چلا جاتا
میری جان اس بے حرکت فالج زدہ جسم میں نکلنے کو بیتاب ہے ۔ جوان اولاد کیوں چلی گئی ۔
مسجد کے سپیکر میں اپنے نام کا اعلان گونج رہا تھا
باہر ایک ہجوم تھا ۔ بے یقینی سی بے یقینی تھی ان کو بھی اور مجھے بھی ۔
آج وہاں میری زندگی بھر کی کمائی کا فیصلہ ہونا تھا کہ میں نے پیچھے کیا چھوڑا ہے ؟؟ اور آگے کیا بھیجا ہے ؟؟

اندر باہر جاتے باہر ذرا آنکھوں کو نم کرتے آنے والوں کو بتاتے کہ ہوا کیا کیسے ہوا کب ہوا

بانت بانت کی بولیاں
یہ کر لو وہ کر لو
اسے بتاؤ اسے بتایا کہ نہیں بتایا

سب ہو رہا تھا جیسے یہ معمول کا کام ہے ۔ ایسے ہوتا رہتا ہے ۔
کیا میرا مرنا اتنا عام ہوگا ؟؟
کیا کوئی ایسا غیر معمولی واقعہ نہیں ہے کسی جیتے جاگتے انسان کا یوں چلے جانا

یونہی وقت گزرا میرا خالی خول جیسا جسم اٹھا لیا گیا
پیچھے سسکتے آہیں بھرتے سب بھرے جسموں کو چھوڑ دیا گیا

اب یہ ناکارہ چیز زیادہ دیر نہیں رکھی جا سکتی ۔

دوسرا منظر :

اچانک سے میرا جسم ایک جھٹکے کے ساتھ بیدار ہوا اور میں اٹھ بیٹھا ۔
گھپ اندھیرا
ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا ۔
دور جاتے قدموں کی چاپ تھی جو لمحہ بہ لمحہ دور جا رہی تھی ۔
پھر روشنی کی ذرا سی لکیر نمودار ہوئی اور ہر طرف روشنی بکھر گئی ۔

وہ فرشتے تھے کراما کاتبین اور ساتھ منکر و نکیر ۔
ان کا کلام تھا
سلامتی ہو ان پر جو حق کو قبول کرتے ہیں برضا و رغبت کے اور افسوس ان پر کہ جو جھٹلاتے ہیں حق کو اپنے تکبر کی وجہ سے ۔
میرے منہ سے غیر ارادی طور پر
اور سلامتی ہو ان پر جو حق کو پہنچاتے ہیں امانت داری سے امین بن کر بڑی ہی راست بازی اور اپنے مالک کی اطاعت سے ۔
ختم شد۔۔۔

ایسانہیں ہوتا

اس کے چیخنے چلانے کی آوازیں عجلہ عروسی سے نکل کر آنگن میں پہنچنے لگی تھی

بے حد کوشش کے باوجود وہ اپنی تکلیف کو عجلہ عروسی کے زندان کی چار دیواری میں مقید نا رکھ سکی ۔
مگر وہ درندہ قوت باہ بڑھانے والی دوائیوں کے زیر اثر باؤلا ہو چکا تھا ۔
اگلی صبح اس نے رات کا احوال اپنی والدہ کو بتایا
ماں نے کہا : ایسا ہوتا ہے
اس کی آنکھیں حیرانی سے یا پھر صدمے سے بڑی ہو گئ
اور اس نے ایک درد بھری سسکی میں بات کو دہرایا
ایسا ۔۔ ہوتا ۔۔۔ہے ؟؟

آئزہ اور فارس پڑھے لکھے افراد تھے ۔ ارینج میرج ہوئی سب خوش تھے ۔
وہ بھی خود بھی خوش تھی
لیکن
اس رات کے بعد نہیں رہی ۔
اس کے لئے اپنے شوہر سے " میریٹل ریپ" سے زیادہ اپنی امی کا یہ کہنا کہ ایسا ہوتا ہے۔ زیادہ تکلیف پہنچانے والا تھا ۔

بچوں کی زندگی میں والدین کی سپورٹ ہر وقت اور عمر میں درکار ہوتی ہے ۔ چاہے وہ غلطی کریں یا چاہے درست ہوں ۔
یہ سوچ آئزہ کی زندگی کو نیا رخ دے گئ تھی ۔
اس نے اپنے والدین پر زور دیا کہ وہ فارس کی والدین سے اس بارے بات کریں ۔
ورنہ اس کے پاس علیحدگی کے علاوہ کوئی حل نہیں ۔
فارس کی جسمانی ساخت میں زنانہ پن کی جھلک دکھائی دیتی تھی جس پر اسے کالج ، یونیورسٹی میں بُلی (Bully) کیا جاتا رہا ۔ اور اس چیز نے اس کی سائیکی پر احساس کمتری کی ایسی چھاپ لگا دی کہ وہ اس کمی کو بھی محسوس کرنے لگا جو کہ اس کے اندر تھی بھی نہیں ۔

پھر سونے پر سہاگا نیم حکیموں نے پھیر دیا ۔

بلآخر آئزہ ہے والدین نے مجبوراً فارس کے والدین سے اس بارے گفتگو کی اور دونوں طرف سے سمجھداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بچوں کو سمجھایا ۔ اور آپس میں فقط جسمانی ہی نہیں روحانی رشتے کو بھی مستحکم کرنے کے لیے ایک دوسرے کو سمجھنے ، ایک دوسرے کی خامیاں خوبیاں جاننے کا مشورہ دیا ۔

جس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا
اور وہ دونوں خوشی خوشی رہنے لگے ۔

ایک سال بعد انہیں اللہ پاک نے بیٹے کی نعمت سے نوازا ۔
آئزہ نے اس بات کا پختہ ارادہ کیا
بیٹے کو سکھائے گی کہ
" ایسا نہیں ہوتا "

10-07-2025

بوجھ

توں ایویں دی بیوقوف تے اجڈ عورت میرے پلے پئی ایں
میری زندگی خراب ہو گئی اے

یزید نے ملیحہ کو مطعون کرتے ہوئے
مادری زبان میں اب تک کے سب سے بڑے الفاظ کہے تھے شاید
وہ خود بھی ذرا چونک پڑا تھا ۔
رملہ ایک کونے میں ڈر کر دبکی بیٹھی تھی ۔
جس کا دونوں میں سے شاید کسی کی طرف بھی دھیان نہیں گیا تھا
یا پھر وہ دھیان لیجانا نہیں چاہ رہے تھے

دو سال پہلے ہی ملیحہ اور یزید کی شادی ہوئی تھی ۔
مگر یہ فیصلہ بہت جلد کیا گیا فیصلہ تھا
کیونکہ ان کی عمریں اس وقت سترہ اور انیس سال تھیں۔

یزید کے والدین کو اس کی غیر اخلاقی سرگرمیوں کا علم ہوا تو انہوں نے اس کا علاج شادی ہی سمجھا ۔
اور اس کے گلے میں یہ ایسی زمہ داری ڈال تھی جس کو اٹھانا اس کے بس میں ہی نہیں تھا ۔
یہ نوے کی دہائی تھی اور دنیا ایک نئی صدی میں داخل ہونے کے دہانے پر تھی ۔
شادی کے چند ماہ تو جوش میں ایسے تیسے گزر ہی گئے ۔
مگر جب ضرورتیں پوری کرنے کے لئے کام کاج کا وقت آیا تو پھر
آٹے دال کا بھاؤ پتا لگا ۔

پیار محبت اپنی جگہ مگر بنیادی ضروریات ہی اگر پوری نا ہوں تو یہ جذبات بھی ماند پڑنے لگتے ہیں ۔
اور اگر ایک بار غیر یقینی کی کیفیت انسان کے اندر گھر کر جائے تو یہ کبھی اپنا مسکن نہیں چھوڑتی ۔

ملیحہ بھی دن بدن مایوسی میں مبتلاء ہونے لگی
جس کی وجہ سے وہ ذہنی دباؤ اور چڑچڑی رہنے لگی ۔
بات بات پر غصہ کرنا اور چیزیں پھینکنے لگنا ۔

دوسری طرف یزید اس سے زیادہ ڈسٹرب رہنے لگا ۔
کام پر جاتا تو وہاں اسے کاہل ، نا تجربہ کار اور بے کار کہا جاتا
گھر آتا تو ملیحہ کا رویہ اسے مزید اس رشتے سے متنفر کرنے لگتا ۔
اسی کشمکش میں دونوں میں دوری اور سال بڑھتے گئے ۔

رملہ اب سن بلوغت کو پہنچ چکی تھی ۔ اور اسکول سے نکل کر اس نے کالج جوائن کیا
نئی دوستیاں ہوئی ۔ نئی نئی جدیدیت کے رجحانات اس میں پنپنے لگے ۔
خاص کر مردوں کے متعلق وہ شدید نفرت میں مبتلاء ہو چکی تھی ۔
اور اس نفرت کی بنیاد اس کے والدین کی غیر ہموار ازدواجی زندگی نے فراہم کی تھی
ساتھ اسے پروان بھی چڑھایا تھا

اس کے گھر سے دو گلیاں چھوڑ فریحہ ادریس کا رہتی تھی ۔ جو کہ اس کی ہم جماعت بنی کالج میں ایک دوسرے سے دوستی ہوئی اور یہ دوستی اٹوٹ انگ میں بدل گئی ۔ ایک کی پسند دوسری کی پسند تھی اور دوسری کی نا پسند پہلی کی ناپسند ۔
اور اس بانڈ میں ایلفی کا کام دیا دونوں کے گھر کا ایک جیسا ماحول اور مردوں سے نفرت نے ۔
پروفیسر جاحظ آج ذرا اچھے موڈ میں تھے اور جب وہ اچھے موڈ میں ہوں تو سمجھیں وہ کسی نئے سوال کو طلباء کے سامنے رکھ کر ان کے تجسس سے لطف اندوز ہونگے
فرائیڈ کہتا ہے:
ایسی خواہشات جن کو دبایا جاتا ہے وہ ختم نہیں ہوتی بلکہ ہمارے لا شعور میں بسیرا کر لیتی ہیں ۔

یوں تو ہم جنس پرستی کا براہ راست والدین کے آپسی رویوں سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔ مگر
کیا آپ لوگوں کو لگتا ہے کہ والدین کے رویے بچوں کے اپنے ہم جنسوں کی طرف رغبت کا باعث بنتے ہیں ؟؟

یہ سوال دل چسپ اور موجودہ صورتحال کے عین مطابق تھا ۔

سب طلباء و طالبات بڑھ چڑھ کر تبصرے پروفیسر جاحظ کے سامنے رکھ رہے تھے ۔
اور وہ مسکرا کر کچھ قبول کرتے کچھ رد کرتے
لیکن
سب سے بے نیاز یہاں رملہ اور فریحہ ادریس ایک طرف ایک دوسرے میں پیوست بیٹھی اس گفتگو سے لا تعلق لگ رہی تھی ۔
یا پھر ساری گفتگو میں وہ بے چینی کا شکار تھی ۔

اس لیکچر سے چند ہفتے بعد کی بات ہے سٹاف روم میں رملہ نے دستک دی اور اندر آنے کی اجازت طلب کی ۔
پروفیسر جاحظ کسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھے ۔
رملہ نے ہچکچاتے ہوئے ان سے ذاتی طور پر درپیش مسئلہ پر اگاہ کیا اور اس کے حل کے لئے درخواست کی ۔
اتفاقاً پروفیسر صاحب اس وقت سگمنڈ فرائڈ کی کتاب
The Ego and the Id
کا مطالعہ کر رہے تھے ۔
پروفیسر جاحظ نے تفصیلاً سمجھایا کہ کیسے آپ اپنی Id کو اپنی Ego کے تابع کر سکتے ہیں ۔

آئیڈ (Id)
لا شعور (unconscious) حصہ، جو فطری خواہشات اور ارادوں کا مرکز ہے۔ یہ "خوشی کا اصول" (pleasure principle) پر عمل کرتا ہے اور فوری سانتوص کی کوشش کرتا ہے۔
ایگو (Ego)
ہوشیار (conscious) حصہ، جو آئیڈ کی خواہشات کو حقیقت کے مطابق منظم کرتا ہے۔ یہ "حقیقت کا اصول" (reality principle) پر عمل کرتا ہے، یعنی تاخیر سے سانتوص اور عملی راستوں کی تلاش۔
سوپر-ایگو (Superego)
اخلاقی ضمیر، جو سماجی قوانین اور والدین کے معیارات کو الگ تھلگ کر کے تشکیل پاتا ہے۔
یہ قصور واری اور شرم کا احساس پیدا کرتا ہے اگر ایگو اس کے معیارات پر پورا نہیں اترتا۔

ان جدید نفسیاتی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ پروفیسر صاحب نے اسلامی تعلیمات خاص کر حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی حوالے سے قرآن پاک میں جو احکام وارد ہوئے اور اس عمل قبیح پر جو ان کر عذاب نازل ہوا اس کا بھی حوالہ دیا جو کہ
جو سورہ الاعراف :-)،78084) سورہ ہود :-)،117783) اور سورہ الشعراء (26:165-175) سمیت دیگر سورتوں میں بیان کیے گئے ہیں۔
ان آیات میں قوم لوط کے مردوں کے غیر فطری جنسی رویے (مردوں کے ساتھ جنسی تعلقات) کی مذمت کی گئی ہے، جسے اللہ تعالٰی نے گناہ اور فحاشی قرار دیا۔ سورہ الاعراف (7:81) میں ارشاد ہے:

"تم اپنی شہوت کے لیے مردوں کے پاس جاتے ہو عورتوں کو چھوڑ کر؟ بلکہ تم حد سے گزرنے والے لوگ ہو۔

رملہ نے بھیگی آنکھوں کے ساتھ اپنے سابقہ بد اعمال کی توبہ کی اور آئندہ کے لیے توبۃ النصوح کرتے ہوئے ۔ اس سے بچنے کا ارادہ کیا ۔
پروفیسر جاحظ نے استقامت کی دعا دی اور رخصت کردیا ۔

15- 07-2025

خوشی

میں بس میں سوار ہوکر سب سے آخر میں چھ مسافروں والی سیٹ پر بیٹھ گیا وہ دونوں میرے آگے والی تین سیٹوں میں سر دو پر بیٹھے تھے ۔
مرد کی رنگت ذرا گہری سانولی تھی اور عورت کی قدرے گندمی سی گہری مگر نین نقش واضح ابھرے ہوئے تھے ۔
دونوں کی گود میں بچے تھے ۔
بیٹا مرد کی گود میں سو رہا تھا اور شیر خوار بیٹی عورت کی گود میں تھی ۔
اتنی دیر میں بوتل چپس والا لڑکا آیا اور عورت نے اس سے بوتل خریدنے کا کہا قیمت پوچھی گئی
140 روپے
مرد نے ہاتھ میں پکڑا موبائل بیوی کو تھمایا اور اپنے ایک ہاتھ سے جیبیں ٹٹول کر پہلے ایک سو کا نوٹ نکالا اور پھر دوسرا
لڑنے اپنے شاپر میں سے سٹنگ (Sting) کی بوتل نکال کر دی اور آگے آواز لگاتا ہوں چلا گیا

عورت کے بوتل کھولی اور پہلا گھونٹ لگانے کو مرد کو تھما دی ۔
پھر ایک شاپر نکالا جس میں نمکو تھی ۔
اور دونوں ہلکی پھلکی گفتگو میں حبس زدہ ماحول کا لطف لینے لگے ۔
کچھ دیر بعد بیوی نے شوہر سے بوتل مانگی تو اس میں چند گھونٹ بمشکل بچی تھی ۔

پہلے اس نے ایک حیران نظر مرد پر ڈالی اور پھر مسکرا دی ۔
میں بھی پیچھے بیٹھا دیکھ کر مسکرا پڑا

میاں بیوی میں خوشی کسی لمبی چوڑی لگژری لائف کی وجہ سے نہیں ہوتی یہ کبھی بھی کہیں بھی ہو سکتی ہے ۔
ہو سکتا ہے کسی محل کے نرم و ملائم بستر پر سونے کے لئے نیند کی دوا لینی پڑے
اور فٹ پاتھ پر بغیر کسی خلل کے کوئی شخص خواب خرگوش کے مزے لوٹتا رہے ۔

07-08-2025

حوا کی بیٹیاں ہوس کی بھینٹ پر

مل لائن میں کام کرنے والا شخص ایچ آر (HR) میں بیٹھے کسی افسر سے لیکر زیلی سطح پر موجود معاون (helper) تک سب ایک سے ہوتے ہیں ۔
شعوری پر ۔
بات بات پر گالم گلوج کریں گے چاہے غصے میں ہوں یا پھر خوش ہوں اکثریت کا تکیہ کلام گالی ہے ۔ ماسوائے چند افراد کے جو آٹے میں نمک کے برابر ہوتے ہیں ۔

اور اسی ماحول میں موجود خاتون ورکرز سروائیو کر رہی ہوتی ہیں ۔
ہماری یہاں بحث اس سے ماوراء ہے کہ وہ مجبوری کے تحت نکلی ہیں یا شوق سے ۔

اصل مدعا ان کی موجودگی ہے اور وہ بھی اس ماحول میں یہاں انہی کے اعضا مخصوصہ کو ایک خاص ترتیب سے زیر استعمال لاتے ہوئے ایسی اصطلاحات اور افعال کا بیان کیا جاتا ہے ۔ جسے عرف عام میں گالی کہتے ہیں ۔

اس کے بعد اس جون ، جولائی کی حبس زدگی میں وہ حجاب میں ہوتی ہیں ۔
اب یہ دو وجوہات کی بنا پر ہوتا ہے ۔
پہلی وجہ تو پردہ ہے ۔

اور دوسری وجہ ہے مل لائن میں موجود حوص خوردہ اشخاص سے بچنا ۔
جن کو اگر آپ کسی ناجائز تعلق کی دعوت دین تو وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ
کے رضامندی ظاہر کریں گے ۔

لیکن
اگر کبھی زندگی میں اتفاقاً اسی لڑکی کا رشتہ دیکھنے کا موقع ملے تو وہ انکار
کردے گا ۔

چونکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ مل لائن میں ہے یہ اچھی لڑکی نہیں ہو سکتی
۔ یہ وہاں موجود مردوں سے باتیں کرتی ہے ۔

اور یہ اکثریت کی ذہنیت ہے ۔

اسی طرح کا ایک واقعہ یاد آیا ایک فیکٹری میں لڑکا لڑکی نے پسند کی
شادی کر لی جس میں لڑکی والوں کو فریق بنایا گیا نکاح کے وقت ۔
مگر لڑکے والے نہیں تھے نکاح ہوا ۔ کچھ وقت گزرا اور لڑکا اپنے آبائی
علاقے میں چلا گیا کہ میں اپنے والدین کو رضامند کرکے اسے لے جاتا
ہوں ۔

وہ گیا پھر کافی دن واپس نا آیا ۔ نا ہی اس سے کوئی رابطہ ہو رہا تھا ۔
لڑکی کے گھر والا نے پولیس میں رپورٹ لکھوائی اور پولیس نے فیکٹری
کوارٹرز پر ریڈ کردی جو کہ فیکٹری کے اندر ہی تھے ۔
پھر جیسے تیسے کرکے لڑکے کا پتا معلوم کیا گیا ۔ اور اسے بازیاب کروایا
گیا ۔

یہاں مرد و زن کے اختلاط کی بات آتی ہے ۔
مگر اصل چیز ہے تربیت اور حدود و قیود کا بیان ۔ لڑکے اور لڑکی کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان کی حد کیا ہے ۔
اور ایسے تعلقات کی صورت میں بہتر طریقہ کیا ہے ان سے نمٹنے کا ۔

اس مہنگائی کے دور میں بڑی مشکل ہے گھر چلانا ۔ نکلنا پڑتا ہے گھر سے

یہ مل لائن بڑے بڑے سیدھے لوگوں کو اوچھا بنا دیتی ہے ۔
ورنہ وہ اس لائن میں سروائیو ہی نہیں کر سکتے اگر وہ سیدھے رہتے ہیں ۔ ۔
لیکن
ٹیڑھ پن کی بھی ضرورت کے تحت افزائش ہونی چاہیے ۔ بے جا نہیں۔

یہ 30 مئی کا دن ہے۔میں اسلام آباد میں چھوٹی سی پارک میں ایک بنچ پر بیٹھا رات کو ہونے والی ہلکی بارش کی وجہ سے موسم کسی قدر خوشگوار ہے ۔اس کو دیکھ رہا ہوں

میری نظروں کے سامنے مارگلہ ہلز کا خوبصورت منظر ہے ۔بلکل کسی بہت ہی خوبصورت پینٹنگ کی طرح کا۔

میں ان پہاڑوں کی خوبصورتی کو دیکھنا اور انہیں چھونا چاہتا ہوں

لیکن ان پہاڑوں اور پہاڑی علاقوں کا یہ مسئلہ ہوتا ہے کہ جہاں پر بہت قریب نظر آنے والی چیز بھی دور ہو جاتی ہے جب اس کی طرف قدم بڑھائے جاتے ہیں ۔

بلکل ایک خوبرو حسینہ کی طرح جس کی خوبصورتی کو آپ دور سے جی بھر کہ محسوس کر سکتے ہیں اور اس سے لطف اندوز بھی ہوسکتے ہیں ۔

لیکن جب اس کی طرف قدم بڑھائے جاتے ہیں تو وہ دور ہی دور ہوتی جاتی ہے۔

لیکن؟اگر آپ اسے محبت سے اپنے قریب لانا چاہتے ہیں تو وہ خود آپ کی طرف قدم بڑھانا شروع کر دیتی ہے ۔

جیسے ہمارے میدانی علاقوں کے لہلہاتے کھیت ،سرسوں کے پھول اور گندم کی ڈالیاں۔

کہ جب تک آپ ان کی نگہداشت کرتے ہیں ،وہ ایسے ہی آپ کہ قدموں میں بچھتی ہیں ورنہ وہ زہریلے کیڑے بھی اپنے اندر پال سکتی ہیں ۔

شادی کے کافی سالوں بعد اس کا میسج آیا ۔ جان پہچان کے بعد (جان میری ،پہچان اس کی) بات چلتے چلتے اس نقطے پر پہنچی کہ وہ پوچھنے لگی
کیا تم اب بھی لکھتے ہو؟
میں نے کہا جی اب بھی لکھ لیتے ہیں (میں کہہ نا پایا کہ اب کیا لکھتے ہیں ،اب تو تیرا تصور بھی مدہم پڑ گیا)

کہنے لگی کچھ سناؤ ،اپنے تازہ لکھے میں سے
میں نے بھی پھر اپنے اور اس کے دل کی اپنی تحریر "بے وفا " سے لکھ بھیجی کہ

"آج اس کے شوہر نے اسے بہت بری طرح پیٹا تھا ،اور جب وہ رو رو کر ذرا سنبھلی تو غیر ارادہ طور پر اس نے اپنے کزن اور سابقہ منگیتر کو میسج کر دیا "

یہ آخری میرے میسج کا سین کر کے پھر وہ معلوم نہیں کیوں آف لائن ہو گئی۔

29/05/2023

اپنی اولادوں کو تباہی سے بچائیں

اس وقت رات کا 1 بجنے کو ہے ۔ جب میں یہ تحریر لکھ رہا ہوں ۔ تاریخ ہے 6 جنوری سن 2024 اور دن ہفتے کا ۔
سرکاری اعداد و شمار کے مطابق میں اسی دن یعنی ہفتے کو پیدا ہوا تھا ۔
پنجاب کے ایک دور دراز علاقے کے ایک وسیع صحرا میں بسے ایک چھوٹے سے گاؤں کے کچے مکان میں ۔ جس لائٹ تک نا تھی ۔
وہاں سے شروع ہوا یہ زندگی کا سفر جس کی میں اس سال مئی میں 25 ویں سالگرہ مناؤں گا ۔
میں یہ نہیں کہتا کہ میری زندگی مشکل گزری ہے یا کہ اب بھی گزر رہی ہے ۔
لیکن میں یہ ضرور کہتا ہوں میرے وقت کا ہر نوجوان جو کہ میرا ہم عمر ہے یا مجھ سے کچھ سال بڑا ہے یا چھوٹا ۔

وہ ایک عجیب سی ذہنی کیفیت سے گزر رہا ہے جو کہ اپنے قریبی رشتوں سے اکتاہٹ ہے دوری ہے یا اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کا ان رشتوں سے وہ ربط وہ اٹیچمنٹ نہیں ہے جو کہ ہونی چاہیے ۔
اب اس کو آپ جو کہ ان کیفیات سے نہیں گزر رہے وہ (over thinking) یعنی ضرورت سے زیادہ سوچنا یا ضرورت سے زیادہ توجہ چاہنا ۔

اب یہ کب کیوں اور کیسے ہوتا ہے ؟
ان پر بات کی جائے تو بات طوالت کا شکار ہو جائے گی ۔
لیکن مختصر اگر کہا جائے تو یہ تب ہوتا ہے جب لڑکا یا لڑکی جوانی کی دہلیز پہ پاؤں دھرتے ہیں اور انہیں کوئی ایسا شخص درکار ہوتا ہے جو کہ ان کے اندر اٹھ رہے وہ نئے خیالات و جذبات کو کوئی راہ دکھا سکیں یا پھر انہیں ان خیالات و جذبات کو بیان کرنے کے لیے کوئی سامع کوئی سننے والا چاہیے ہوتا ہے ۔

اب یہاں پر اگر بیٹی کی ماں کے ساتھ اور بیٹے کی باپ کے ساتھ اچھی انڈرسٹینڈنگ ہے تو وہ انہی کی طرف متوجہ ہونگے اور اپنی ساری کیفیات ان سے ڈسکس کریں گے ۔

(جو کہ بد قسمتی سے ہمارے معاشرے میں بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے)
اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو وہ نئے پر نکالتے پرندوں کو چیلیں دبوچ لیتی ہیں ۔ پھر ساری زندگی ان پنجوں سے جسم نکال بھی لیں تو ذہن نہیں نکال سکتے وہ کبھی ذہنی طور پر صحت مند زندگی نہیں گزار سکتے ہیں ۔

اس ساری گفتگو کا مقصد صرف اتنا سا ہے کہ
خدارا اپنی اولادوں پر ایسا ظلم نا کریں کہ وہ آپ لوگوں کے ساتھ آپ لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی یا خود کو اجنبی تصور کریں یا آپ لوگوں کو ۔

ٹھیک پیسہ اس وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے لیکن اولاد سے بڑا کوئی سرمایہ نہیں ہے کوئی دولت نہیں ہے ۔ ان کے پاس بیٹھیں ان کو وقت دیں ۔ ان کو یقین دلائیں کہ وہ آپ کے لیے اہم ہیں قیمتی ہیں ۔

تاکہ وہ آپ کو اپنا دوست سمجھیں ورنہ جو اس دور چل رہا ہے ۔ اس میں ہر طرف آگ ہے جس کی ذرا سی آنچ بھی آپ کے لخت جگر کو جلا ڈالے گی ۔

کل کے مجاہد، آج کے دہشتگرد

تم ان سب کو لے جاؤ اور اس سارے علاقے میں پھیلا دو ۔ جہاں لوگوں نے ہمیں ووٹ دینے سے انکار کیا ہے ۔
غلام نبی نے ادب سے سر جھکائے یہ احکام سنیں اور علامہ صاحب کی طرف پشت کیے بغیر الٹے قدموں باہر نکل گیا ۔

غلام نبی کے جانے کے بعد علامہ نے دروازہ بند کیا اور ایک مخصوص موبائل نکال کر اس پر کال ملائی دوسری طرف سے شناخت پوچھی گئی
"خدا کی خدائی چند دن کی ہے"
شناخت قبول کرلی گئی ۔
جی باس کام شروع کردیا گیا ہے
ملک میں فرقہ ورانہ فسادات اور اقلیتوں کے علاقوں میں نوجوانوں کی ڈیوٹیاں لگا دی گئی ہیں ۔
دوسری طرف سے بس خاموش سنائی دے رہی تھی ۔
علامہ صاحب پر خوف طاری ہو رہا تھا کہ معلوم نہیں باس غصے میں ہیں ؟؟
اسی اثنا میں دوسری طرف سے آواز گونجی رعب دار اور تحکم سے کہا گیا
ابھی تک تو آدھا کام ہو جانا چاہیے تھا ۔
ہمیں اس ملک میں
تباہی چاہیے تباہی
ہر صورت اور ہر قیمت پر

اس کے لیے ہم تجھ جیسے بھوکے ننگے دو وقت کی روٹی سے تنگ ملاؤں کو منہ مانگی قیمت دے کر خریدتے ہیں اور ہمیں بھی پھر مرضی کا کام اور وہ بھی وقت پر چاہیے ہوگا ۔ ورنہ لوگ بہت ہیں کرنے والے اور جو نا سکیں ایسے لوگ ہمارے کام کے نہیں رہتے اور ہم انہیں رستے سے ہٹوا دیتے ہیں ۔

پہلے سے ڈرے سہمے علامہ صاحب مزید خود کو کسی بڑے اژدھے کے سامنے محسوس کر رہے تھے جس کی پھنکار وہ سن رہے تھے اور بس نگلنا باقی تھا۔

اس کے منہ بس اتنا ہی نکلا

ج ج ج جو جو ۔۔ حکم سرکار ہم آج ہی سے کام میں تیزی لاتے ہیں ۔

کال بند کردی گئی

علامہ خادم علی ایک مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے ۔ والد صاحب سادہ لوح انسان تھے اور گاؤں کی مسجد میں امام و خطیب کے فرائض انجام دیتے رہے ساری زندگی ۔ گاؤں والے سال بعد گندم دے دیتے جو سال کے لیے کافی ہوتی باقی ہر جمعرات ، جمعرات کی روٹیاں اور طرح طرح کے پکوان بھی آ جایا کرتے ۔ سب گاؤں والے ان کا احترام کرتے تھے اور بہت اچھی تو نہیں لیکن گزر بسر گزارے لائق ہو جاتی تھی ۔

جب انکی وفات ہو گئی تو یہ زمہ داری خادم علی کو سونپ دی گئی ۔ لیکن اب وقت پہلے جیسا نہیں رہا تھا لوگوں کے مزاج اور زمانے کا چلن بھی بدل چکا تھا ۔ نا وہ روکھی سوکھی پر پلنے والے اب رہے تھے اور نا ہی روکھی سوکھی مہیا کرنے والے ۔

گھریلو اخراجات سے تنگ آ کر خادم علی نے مسجد انتظامیہ سے بات کی اور انہیں کسی اور امام مسجد کا انتظام کرنے کا کہہ کر خود شہر میں کسی مسجد کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کیے ۔
گاؤں سے شہر منتقل ہونے والے کئی لوگ تھے شہر میں ان سے رابطہ کیا گیا ۔ اور ایسے تیسے کرکے ایک مسجد میں امامت تو نہیں لیکن مؤذن اور خادم مسجد کی ذمہ داری مل گئی ماہانہ تنخواہ اتنی زیادہ تو نہیں تھی لیکن گاؤں سے بہتر ہی تھی ۔
یہاں اسے چند ماہ ہی ہوئے ہونگے کہ افغان جنگ کا شور سنائی دینے لگا ۔ جسے افغان جہ۔۔اد بتایا جا رہا تھا ۔ خادم علی مسجد کے ساتھ ساتھ قریبی ایک مدرسے میں بچوں کو پڑھانے بھی چلا جایا کرتا تھا ۔ وہاں کے بڑے منتظم و مہتمم سے اچھے تعلقات بن گئے تھے ۔
افغان روس جنگ شروع ہوئی تو اس میں بطور ایندھن دینی مدارس میں پڑھنے والے نادار اور کچے ذہنوں کے افراد کو استعمال کیا گیا ۔
مدرسے کے مہتمم کو خادم علی کے حالات کا بخوبی اندازہ تھا ۔ اس نے خادم علی کو مشورہ دیا کہ تم جوان ہو صحت مند ہو تو کیوں نا تم افغان جہ۔۔اد میں حصہ لو تاکہ تمہارے گھر کے اخراجات اٹھا لیے جائیں ۔

" بھوکے کا مذہب روٹی ہوتی ہے "

روٹی پیٹ میں ہوگی تو عبادت بھی سمجھ آتی ہے بھوکے پیٹ تو بدھا کو بھی خدا نہیں ملتا ۔

خادم علی نے مشورہ مان لیا اور مہتمم کے ساتھ تربیتی کیمپ چلا گیا ۔
چھ ماہ کی تربیت کے بعد اسے میدان میں اتار دیا گیا ۔ یہاں اس نے بھرپور بہادری اور جوش و خروش کے ساتھ دشمنوں کا مقابلہ کرتا رہا ۔ اور اس کے گھر کا چولہا جلتا رہا تھا ۔

ایک صبح ابھی سورج طلوع ہو رہا تھا اور وہ باہر رفع حاجت کے لیے نکلا ۔ آج اس کی طبیعت ذرا خراب تھی اور پچھلی رات کے کئی ایک کے بعد ایک دھماکوں سے کان سائیں سائیں کر رہے تھے ۔ اسی اثنا میں کہیں دور سے جنگی طیاروں اور ہیلی کاپٹرز کے آنے کی آواز آئی جو کہ قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی ۔ اور چند ہی لمحوں میں اس کے سنبھلتے سنبھلتے اوپر سے بہت سے جنگی طیارے گزرے لیکن پیچھے وہ آگ کا طوفان چھوڑتے جا رہے تھے ۔ اور یہ ہوائی حملہ تھا جو روسی جنگی طیاروں کر رہے تھے ۔

شور تھا ہر طرف چیخ و پکار ، آہ و بکا دھوئیں اور آگ کے مرغولے اوپر فضا میں نظر آنے لگے تھے ۔

اور خادم علی نے یہ وہ آخری منظر تھا جو غنودگی میں جانے سے پہلے دیکھا تھا ۔

تیز چنگھاڑ سے اس کی ہلکی سی آنکھ کھلی اور پھر سے منظر غائب ہو گیا ۔ لیکن

اس کے حواس خمسہ نے جلد ہی بحال ہونا شروع کیا اور اس کے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگی کہ کچھ تو گڑبڑ ہے ۔

پھر اس نے پوری قوت لگا کر آنکھوں کو کھولا

مگر قوت ؟؟؟؟؟

قوت ارادہ تو پورے جسم پر لگی تھی جسم کیوں حرکت میں نہیں آیا ؟؟

یہ پیغام دماغ نے جیسے ہی آنکھوں تک پہنچایا تو خادم علی نے وہ منظر دیکھا جس کا تصور بھی جان لیوا تھا

اس کے اوپر لاشوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا جن سے فضاء میں اڑتے اور ان لاشوں پر بیٹھے بڑے بڑے گدھ نوچ نوچ کر ماس کھا رہے تھے

اس نے پھر سے زور لگا کر جسم کو حرکت دینے کی کوشش کی اور کچھ آدھ کھائی لاشوں کو پرے دھکیل

اٹھنے کی اور وہاں سے بھاگ نکلنے کی ناکام کوشش کی
مگر
یہ کیا وہ تو اٹھتے اٹھتے پھر سے گر گیا اور تب اس کے تمام اعصاب بیدار ہو چکے تھے اور سب سے اہم پیغام دماغ تک پہنچا دیا گیا تھا ۔
اب دماغ نے بغیر کسی لمحے کو ضائع کیے وہ پیغام باقی ماندہ اعضاء تک پہنچ دیا تھا کہ وہ ٹانگوں سے معذور ہو چکا ہے اور وہاں اسے پھینک جانے والوں کے لیے مر بھی چکا ہے ۔

اگر وہ پہلے موت سے بچ بھی گیا تھا تو سر پر ابھی بھی موت منڈلا رہی تھی ۔
مردار خور گدھ زندہ اجسام کو اپنے لیے خطرہ سمجھتے ہوئے انہیں مردار کرنے کی جستجو کرنے لگتے ہیں ۔ خادم علی کو یہی خدشہ تھا کہ گدھ اسے حرکت کرتے دیکھ کر حملہ کریں گے ۔
وہ اپنا دھڑ گھسیٹتا ہوا اس لاشوں کے ڈھیر سے دور جا رہا تھا کہ لاشیں اس کی جانی پہچانی تھی جن کے ساتھ وہ کئی مہینوں سے رہ رہا تھا ۔ اور اب وہ بے یارو مددگار پڑی تھی ۔
دو مہینوں کی تگ و دو کے بعد مختلف جگہوں پہ رہنے اور اپنے زخم مندمل ہونے کے بعد وہ ایک قافلے کے ساتھ پشاور پہنچا اور یہاں اس نے اپنے پرانے جاننے والوں سے رابطہ کیا ۔ جنہوں نے اسے ہسپتال میں داخل کروایا اور اس کے زخموں کے ٹھیک ہونے تک اس کا خرچ اٹھایا ۔
ان دنوں پشاور اور اس کے مضافات میں دھماکے عام بات تھی اسی لیے اس کے زخموں پر زیادہ تفتیش و تشویش نہیں ہوئی کسی کو ۔
صحت مند ہونے کے بعد دوبارہ سے وہ کسی کام کی تلاش میں تھا لیکن اب وہ پہلے جیسا نا جسم رہا تھا اور نا ہی وہ پہلا والا کام کر سکتا تھا مگر اسے پیسوں کی ضرورت تو بہرحال تھی ۔ اپنے اہل عیال کا پتا کرنا تھا

جن سے کئی ماہ سے رابطہ ہی نہیں ہوا تھا ۔
پرانے جاننے والے جس کے توسط سے وہ جہ۔۔ادی گروپ میں شامل ہوا تھا ۔ اس کو بھی ملٹری والوں نے گرفتار کرلیا ہوا تھا ۔
لیکن اس کا ایک اور ساتھی تھا جس کا پتا اسے یاد تھا ۔ وہ اس کے پاس جانے کا ارادہ کرتا ہے اور اس سے مل کر کسی ذریعہ معاش کا بندوبست کرنے کہتا ہے ۔
غربت ، ضرورت ، لالچ انسان کو انسان نہیں رہنے دیتے ان حالات میں انسان ہر چیز سے بے پرواہ ہوکر انہیں چیزوں کو مقصود کائنات بنا لیتا ہے ۔ پھر اس کے راستے میں نا کوئی انسانیت آ سکتی ہے نا کسی مذہب کی تعلیمات ہی اسے درست کر سکتی ہیں ۔
"روٹی کی بھوک روٹی ہی مٹا سکتی ہے صحیفے نہیں "

اس شخص جس کو خادم علی مولانا عبد الحق کے نام سے جانتا تھا ۔اس کے اسے ایک مدرسے میں بھیجا جو کہ اصل میں جہ۔۔ادی تربیت گاہ تھی ۔ اور خاص کر فدائیان کی تربیت کے لیے مخصوص تھی ۔ خادم علی کو وہاں رہ کر یہی فدائی تیار کرنے تھے ۔ جو کہ خود کش بمبار ہوتے ہیں اور ان کی عمریں زیادہ سے زیادہ دس (10) سال تھی ۔
یہ 90 دہائی کا آغاز تھا روس افغانستان سے نکل چکا تھا ۔
اور اب باری تھی نیٹو افواج کی کہ وہ اب افغانستان سے نکلیں مگر وہ خفیہ طور پر اپنے پنجے وہیں گاڑنا چاہتی تھی
چونکہ اس کے مفادات باقی تھے ۔ جو سرمایا کاری اس نے افغان جہ۔۔ادی تنظیموں پر کی تھی اس کا منافع پورا نہیں ملا تھا ۔
اسی دھکم پیل میں 90 کی دہائی بھی گزر گئی اور نئی صدی کا آغاز ہو گیا ۔
خادم علی صبح کی مشقیں کروانے کے بعد اپنے مخصوص کمرے میں موجود تھا جس کی دیواریں ساؤنڈ پروف تھی ۔

اور اس میں ڈش ٹی وی چل رہا تھا جس پر بریکنگ نیوز چل رہی تھی ۔ کہ دو ہائی جیک طیارے امریکن ورلڈ ٹریڈ سینٹر سے یک بعد دیگرے ٹکرا گئے ہیں ۔

خادم علی اسے ایک ایسی مسکراہٹ کے ساتھ دیکھ رہا تھا کہ جیسے اسے کسی ذاتی اور دلی مقصد میں کامیابی مل گئی ہو ۔ اور ایسا ہی تھا کہ اسے فدائیوں کو سنانے اور جوش دلانے کے لیے ایک خبر مل گئی تھی جسے اس نے کیش کرنا تھا ۔
دراصل پچھلے دس سالوں میں خادم علی نے فدائی تیار کرنے میں بڑا نام بنا لیا تھا کہ اور اس کا چرچا جہ۔۔ادی تنظیموں کے بڑوں تک اور وہاں سے اس کے بڑوں تک بھی پہنچ چکا تھا ۔ اور وہ خود خادم علی سے براہ راست بھی رابطے میں رہنے لگے تھے ۔
مگر یہ دور اب زیادہ دیر تک اور محفوظ نہیں رہا تھا ۔ کہ امریکہ نے نیٹو افواج کو افغانستان کی طرف کوچ کا حکم دے دیا تھا ۔ اور جن لوگوں پر سرمایہ کاری کرکے انہیں مذہب کے نام پر جذباتی کرکے مجاہد بنایا گیا تھا اب وہ اس کی اپنی سالمیت کے لیے خطرہ بن چکے تھے ان کا قلقمہ کرنے کا وقت آ گیا تھا ۔
اب دوبارہ سے اپنے حامیوں کو ڈالر بھیجے گئے تاکہ جنہیں پال پوس کر خونخوار بنایا گیا تھا ان کے خون اور خواری کا انتظام کیا جا سکے ۔
خادم علی کو بھی مسلسل اندرونی اور بیرونی دونوں جانب سے خبریں مل رہی تھی ۔ لیکن
اب انہیں مجاہد نہیں دہشتگرد کہہ کر مخاطب کیا جا رہا تھا ۔

خادم علی نے اپنے ہینڈلرز سے رابطہ کیا اور روپوش ہو گیا ۔ شناخت بدلی اور پھر بیرونی ایجنٹ بن کر ملک میں مصنوعی فسادات شروع کروانے کے لیے جتھا تشکیل دیا جو لوگوں کو مذہبی و مسلکی اختلافات پر اکساتا اور قتل و غارت کرواتا۔
خادم علی نے غربت قریب سے دیکھی تھی اور وہ ڈرتا تھا اس سے ۔ اور وہ اسی ڈر سے بچنے کے لیے خون کے لقمے کھانے لگا ۔

13-12-2024

گستاخ بستی

علینا ورکنگ ایریا میں داخل ہوتے ہی سیدھی اپنی مشین کی طرف آئی ابھی بیٹھی بھی نہیں تھی کہ فاخرہ نے اسے اطلاع دی کہ باس نے دفتر میں بلایا ہے ۔
شاید باس نے سی سی ٹی وی کیمرہ میں دیکھ لیا تھا اسے ۔
وہ دفتر میں داخل ہوئی تو اس کے چہرے پر ایک کراہت آمیز ایکسپریشنز تھے ۔
داخل ہو کر اس نے سلام کیا اور کھڑی ہوگئی ۔ دلاور نے اسے طنزیہ مسکراہٹ سے دیکھتے ہوئے پوچھا کہ
کیا سوچا پھر تم نے ؟ کیا میری آفر پسند آئی یا نہیں ؟
میری چند خواہشات ہیں جو تم نے پوری کرنی ہیں اور پھر جو تمہاری ہونگی وہ میں کردوں گا ۔
علینا کے چہرے رنگ نیلا ہو چکا تھا غصے کو ضبط کرکے وہ صرف اتنا کہہ پائی " میں تم پر ، تمہاری خواہشات پر اور تمہاری اس فیکٹری پر لعنت بھیجتی ہوں "
وہ اسی طرح غصے سے آگ بگولہ دفتر سے نکل گئی ۔ لیکن وہ دن اسے کسی نا کسی طرح گزارنا ہی تھا یہ ملعون شدہ فیکٹری میں ۔
دلاور نے اس کے جاتے ہی میز پر پڑا شیشے کا گلاس سامنے دیوار پر دے مارا ۔
میں تمہیں دیکھ لوں گا ، تجھ جیسی چوڑی کی اوقات کہ مجھے انکار کرے ۔ دیکھ لوں گا تمہیں میں ۔

نعیم صاحب سرگودھا بلدیہ میں بڑے عہدے پر موجود تھے جو کہ ان کے بہنوئی کی کرم فرمائیوں کا نتیجہ تھا ۔ بہنوئی الیکشنز کے بعد وفاقی وزیر بنے تھے ۔ نعیم صاحب نے میٹرک کے بعد 3 سالہ سول انجینئرنگ کا ڈپلومہ کیا تھا اور اب انہیں بڑا شوق تھا کہ وہ کوئی بڑی سوسائٹی کی تعمیر کریں اسی مقصد کے لیے انہیں شہر کے مغرب میں نہر کے ساتھ ساتھ جو زمین تھی کافی اچھی لگی ۔

لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہاں پر تو آبادی موجود تھی اور کچھ کچے اور کچھ نیم پکے مکان تھے ۔ مالکان مزدوری کرتے اور بیوی بچوں کا پیٹ پالتے ۔
شہر کے سبھی بڑے پراپرٹی ڈیلروں سے بات کی گئی اور اس زمین کو ہر کلئیر کروانے کا کہا گیا ۔
پراپرٹی ڈیلروں نے کچی بستی میں آنا جانا شروع کیا اور بڑے بزرگوں سے لیکر کر نوجوانوں تک کو شہر کے اندرون بہتر سہولیات اور روزگار کے اچھے مواقعوں کی پیشکش کے ساتھ اپنے مکان بیچنے پر راضی کرنے کی کوشش کی ۔ لیکن کوئی بھی راضی نا ہوا ۔
کافی دن جب یہی ہوتا رہا تو بلدیہ کے دفتر میں سب کو جمع کیا گیا اور رپورٹ طلب کی گئی ۔ سب نے مایوسی کا اظہار کیا ۔
دقت یہ تھی کہ اس کیمرے اور منہ پھٹ عوام کی وجہ سے کوئی بھی ایسی کاروائی عمل میں نہیں لائی جا سکتی تھی جو کہ ان پر مشکلات کے دروازے کھول دے ۔ لیکن نیا عہدے اور کرسی کی گرمی کہاں چین لینے دیتی ہے ۔
مشاورت کے دوران ایک تجویز دلاور حسین نے دی جسے سب نے فوراً قبول کر لیا اور اس پر عمل درآمد کی زمہ داری بھی دلاور حسین کو ہی دی گئی ۔
دلاور کی شہر میں گارمنٹس فیکٹری تھی اور نعیم صاحب کے لنگوٹی کے یار تھے ایک دوسرے کے ہر سیاہ و سفید سے واقف ۔
دلاور حسین نے اپنے منشی نذر فقیر کو رازداری سے پوچھا کہ علینا چوڑی آئی ہے ؟ منشی نے کہا کہ نہیں وہ دو تین دن نہیں آئی ۔
پھر دلاور حسین نے اگلا لائحہ عمل بتانا شروع کیا اور منشی نذر فقیر کا رنگ فق ہونے لگے ۔ انسان چاہے عملاً مذہب پر کار بند نا بھی ہو تو وہ اپنے مذہب کے متعلق حساس ضرور ہوتا ہے ۔
لیکن یہاں ایک طرف دنیا تھی اور دوسری طرف آخرت پر منشی نذر فقیر کو جو دلاور حسین نے دنیا دکھائی اس نے اس کے دلوں دماغ سے آخرت کو محو کردیا اور اسے پھر شیطان نے اچک لیا ۔
دفتر سے باہر نکل کر منشی نذر فقیر سیدھا فیکٹری کی مسجد کی طرف گیا یہاں پر ایک سبز رنگ کے گھی کے خالی ڈبے پر " اوراق مقدسہ اس میں ڈالیں " عبارت لکھی ہوئی تھی ۔ اس نے ارد گرد دیکھا اور اس میں سے چند کاغذات نکال کر اپنی واسکٹ کی جیب میں ٹھونس لیے

اور واپس فیکٹری ورکنگ فلورز کی طرف چل پڑا ۔
دوپہر کے کھانے کا وقت تھا اور فلورز پر لائٹس بند تھی اکا دکا لوگ تھے جن میں سے کچھ سوئے ہوئے تھے اور باقی کینٹین میں کھانا کھا رہے تھے ۔
منشی نذر فقیر نے چپکے سے علینا کی مشین کے ساتھ رکھے کچرے کے ڈبے میں وہ کاغذات ایسے ڈالے کہ ذرا سا غور کرنے پر نظر آ جائیں ۔
اس کاروائی کے بعد وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہو پسینے سے شرابور دلاور حسین کے دفتر میں داخل ہوا اور صوفے پر گرنے کی سی کیفیت میں بیٹھتے ہی اپنی اتھل پتھل ہوتی سانسوں کو بحال کیا
دلاور کو ہاتھ سے مثبت کا اشارہ دیا اور آنکھیں موند لیں ۔
اب اگلا کام دلاور حسین کا شروع ہونا تھا لیکن لنچ بریک ختم ہونے کے بعد ۔
لنچ بریک ختم ہوئی اور اس نے فلور انچارج کو اطلاع دی کہ علینا کو فارغ کردیا گیا ہے اس کی مشین چیک کرو اور اس پر نیا بندہ بٹھا دو ۔
فلور انچارج نے فوراً مکینک کو کال کی اور اسے بلا کر مشین کے معائنے کا بولا مکینک آیا اس نے مشین دیکھی ۔ تسلی کی دو تین بار کٹ پیس پر الٹی سیدھی سلائیاں لگا کر ٹانکا چیک کیا اور وہ کٹ پیس سے ہاتھ صاف کرکے جیسے ہی اس نے کٹ پیس کچرے والے ڈبے میں پھینکنے کے لیے ہاتھ بڑھایا اس کی نظر وہاں موجود کاغذات پر پڑی ۔ اس نے نکالے انہیں چوما اور پوچھا کہ یہ مشین کس کی ہے ۔
اسے بتایا گیا کہ ایک مسیحی لڑکی علینا اس پر کام کرتی تھی جو اب نہیں آرہی دو تین دن سے ۔
اسی شور شرابے میں دلاور حسین اور منشی بھی وہاں پہنچ گئے ۔
دلاور حسین کہنے لگا کہ ہمیں علینا پر پہلے ہی شک تھا کہ یہ یہاں پر موجود لوگوں سے نفرت کرتی ہے اور مذہبی انتشار پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے ۔
ہم نے اسے دفتر میں بلا کر سمجھایا بھی تھا ۔
پھر فاخرہ کو مخاطب کرکے پوچھا کہ بتاؤ جمعرات کو بلایا تھا نا دفتر میں ؟؟
فاخرہ اس اچانک سوال سے پریشان ہوگئی اور جلدی سے " ہاں " میں سر کو ہلایا ۔
دلاور پھر مخاطب ہوا کہ میں نے جب اسے سمجھایا تو وہ آگ بگولہ ہوکر دفتر سے نکل گئی اور پھر اس دن کے بعد واپس بھی نہیں آئی ۔

عوام آگ بگولا ہو چکی تھی اور رہی سہی کسر دلاور کی جھوٹی کہانی نے پوری کردی تھی ۔ کاغذات کی تصاویر سوشل میڈیا پر پھیل چکی تھی اور ساتھ ہی علینا کا نام اور اس کی بستی کا نام بھی بتا دیا گیا تھا ۔ پورے شہر کی منڈیر کچی بستی کی جانب جارہی تھی ۔ ہاتھ میں لکڑی کے ڈنڈے ، پلاسٹک کے راڈ تھے اور وہ نعرے بازی کرتے ہوئے سمت میں اور تعداد میں بڑھتے ہی جا رہے تھے ۔

نعیم نے علاقے کے ایس ایچ او کو منع کردیا کہ کچھ وقت کے لیے کسی بھی ایکشن سے اجتناب کریں ۔

عوام نے شیطانی غیرت میں پوری بستی کو نیست و نابود کردیا ۔

بستی مکینوں کو اپنے گھر بار چھوڑ کر اپنے رشتے داروں کے ہاں جانا پڑا اور یہ " گستاخ بستی " خالی ہو گئی ۔

دو سال بعد وہاں ایک سوسائٹی تعمیر ہوئی جس کا نام تھا " مدینہ ٹاؤن " ۔

9-مئی-2 2024



Hate Economy







ہم سمجھتے ہیں کہ یہ جو فسادات ہوتے ہیں یہ کوئی نقصان دہ چیز ہے نہیں
یہ ایک کاروبار ہے بہت سے لوگ انہی مسلکی ، لسانی ، مذہبی ، سیاسی فسادات سے کروڑوں کماتے ہیں ۔
اسے کہتے ہیں
Hate Economy
اس کاروبار میں ہر طرح کے افراد شامل ہوتے ہیں ، ہر طبقے اور ہر شعبے سے وابستہ ۔
جو کہ لوگوں کی نفرتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دولت کماتے ہیں ۔
" اور ایندھن ہیں جاہل عوام "

ہر انڈسٹری میں کوئی نا کوئی چیز "خام مال" کے طور پر استعمال کی جاتی ہے اور پروڈکٹ تیار کر کے جنہیں بیچی جاتی ہے انہیں "کنزیومر" کہا جاتا ہے
"Hate Economy"
میں خام مال کسی بھی معاشرے کے لوگوں کے حساس رویے ہوتے ہیں ۔ انہیں جذباتی باتوں اور تقریروں سے بڑھایا جاتا ہے کسی بھی اپنے مخالف شخص ، نظریے یا جماعت کے متعلق اور پھر ان کو من چاہے کاموں میں استعمال کیا جاتا ہے ۔
کیونکہ نفرت جتنی زیادہ ہوگی منافع اتنا ہی زیادہ ہوگا ۔

دنیا میں کوئی بھی طبقہ ہے چاہے وہ مذہبی ہیں یا لادین ، سیاسی ، گھریلو اشخاص ،
ہر شعبے اور اور ہر ملک میں اکثریت ایسے ہی افراد کی ہے جن کا تعلق اسی " نفرت کے کاروبار" سے ۔
کسی معمولی سیاسی کارکن سے لیکر دنیا کی سوپر پاورز تک انحصار اسی کاروبار پر ہے ۔
کسی گاؤں دیہات اور زیادہ تر شہروں میں بھی ایسے بہت سے مذہبی مل جائیں گے جنھوں نے رٹا ہی مخالفین کے خلاف نفرت انگیز تقاریر پر لگایا ہوا ہے
ملحدین ، لبرلز، بھی اسی طرح کے ہیں
سیاسی جماعتیں بھی اسی پیٹرن پر چلتی ہیں ۔
جو شخص بھی اعتدال پسند ہوگا یا علمی گفتگو کرتا ہوگا ایسے شخص کے متعلق کہا جاتا ہے یہ " ٹھنڈا اور بورنگ" شخص ہے ۔
علمی گفتگو کرنے والے اتنے مشہور نہیں ہوتے جتنے جوشیلی اور مخالفین کی دھجیاں بکھیرنے والا مشہور ہوگا ۔
عام کاروبار کو اسٹیبلش کرنے اور پرمننٹ کسٹمرز کے لیے کم از کم 5 سال کا عرصہ درکار ہوتا ہے ۔
لیکن " نفرت کے کاروبار " میں یہ کام بہت کم عرصے میں ہو جاتا ہے ۔
مثلاً کسی بھی کرائے کے شخص کو جعلی مولوی بنا دیا جائے کسی مسلک کا اور پھر اس سے من چاہے نفرت انگیز بیانات دلوائے جائیں کسی دوسرے مسلک کے لیے ۔ اور اس سوشل میڈیا کے دور میں اس کو عام کرنا بہت ہی آسان ہے ۔

اب یہ بیان جس جس تک پہنچے گا وہ زیادہ تر اس کو جذباتی ہو کر دیکھے گا اور اشتعال میں آ جائے گا ۔

یہی ہر طرف ہوتا ہے سیاسی ، مذہبی ، لسانی اور ہر قسم کے فسادات ایسے ہی کرائے کے جعلی لوگوں سے کروائے جاتے ہیں ۔ اور اکثریت ان فسادات کا شکار ہوکر جانے انجانے میں
"Hate Economy"
کے لیے ہم خام مال کا کام دینے لگتے ہیں ۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ اس میں کنزیومر بھی ہم خود ہی ہیں ۔ یعنی ہم خود ہی اپنا گوشت کاٹنے والے ، بیچنے والے اور خریدنے والے بن جاتے ہیں ۔
لیکن اس کا معاوضہ ہمیں نہیں ملتا کسی اور کو ملتا ہے۔ ہم صرف نقصان اٹھاتے ہیں ۔
برصغیر میں اس کاروبار میں سب سے بڑا استعمال مذہب کو کیا جاتا ہے جس میں ہندو مت اور اسلام ان دونوں مذاہب کو کئی دہائیوں سے استعمال کیا جا رہا ہے اور ان میں اصافہ ہی دیکھنے کو ملا ہے ۔

مذہب کے معاملے میں اکثریت جذباتی ہوتی ہے اور ان کو اسی کے استعمال سے سب سے زیادہ فائدہ مند بنایا جا سکتا ہے ۔
انسان جتنا بھی جرائم پیشہ ہو یا برائے نام مذہبی ہو لیکن جب اس کو مذہب ک نام لیکر مشتعل یا حساس رویے سے چھیڑ چھاڑ کرکے بھکایا جائے گا تو وہ سب سے زیادہ خطرناک ہوگا اور نفرت کا کاروبار کرنے والوں کے لیے اتنی ہی فائیدہ مند ۔
اس کو سمجھنے کے لیے اگر ہم صلیبی کا مطالعہ کریں تو ہمیں ان پوپس کا ذکر ضرور ملے گا جنھوں نے اس کو "مقدس جنگ" کہہ کر اپنے ملکوں کے نوجوانوں کو نکلنے پر اکسایا کہ یہ مقدس جنگ ہے جس میں خداوند متعال ان کو پکار رہا ہے مقدس صلیب کے سائے میں ۔

اور پھر جوک در جوک لوگ بیت المقدس کی طرف کوچ کرنے لگے ۔
دوسری طرف سلطان صلاح الدین ایوبی اور ان کے ساتھیوں کے لیے بھی یہ مقدس جنگ ہی تھی ۔ قبلہ اول کی آزادی اور حفاظت ۔
تو کہنے ک مقصد ہے کہ مذہب کے نام پر کسی کو بھی اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا آسان ہے ۔
یہاں موضوع "مذہب" نہیں بلکہ اس کا "برا استعمال" ہے

امریکہ جنگی ہتھیار سپلائی کرنے والا سب سے بڑا ملک ہے اور اس کی معیشت کا یہ کافی اہم حصہ ہے ۔ دنیا میں جہاں جہاں بھی خانہ جنگی ہو رہی ہے اس کا سبب چاہے امریکہ نا لیکن اس سے فائیدہ اسے ہی ہو رہا ہے اور زیادہ تر میں تو خود شامل بھی ہے یا رہا ہے عراق ، شام ، لیبیا میں موجود ہے اسرائیل کی پشت پناہی کرتے ہوئے فلسطین میں موجود ہے تین دہائیوں تک افغانستان میں موجود رہا ہے ۔
کسی بھی حریف دو ملکوں کی جنگ ہو یہ دونوں کو ہتھیار سپلائی کرتا ہے ۔ جس کی زندہ مثال سعودیہ ایران تنازعات ہیں ۔ یہ دونوں ممالک جنگی ہتھیار امریکی سے ہی لیتے ہیں اور اپنی اپنی پروکسیز کو مہیا کرتے ہیں ۔
امریکی معیشت کا 3.5 فیصد جنگی ہتھیاروں کی فروخت سے ہی آتا ہے اور 2022 کے عداد و شمار کے مطابق یہ 746 بلین امریکی ڈالر بنتا ہے ۔
اور اس کے بعد اسے 1.1 ٹریلین امریکی ڈالر تک لیجانے کی پیشنگوئیاں ہوئی تھی ۔
جیسے کووڈ 19 بہت سے لوگوں کے لیے ایک عذاب اور زحمت تھا لیکن اس میں کئی لوگوں کے لیے یہ ایک رحمت تھا ۔ جس میں کئی کاروباری افراد نے اس سے بھی لاکھوں کروڑوں کا کاروبار کیا ۔ سرجیکل ماسک ، اور اس طرح کے کئی حفاظتی آلات بنانے والی انڈسٹریز نے خوب پیسہ کمایا ۔

بلکل یہی حالات " نفرت کا کاروبار" کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے جو حالات عام لوگوں کے لیے زحمت سے پر ہوتے ہیں وہی ان کے لیے باعث رحمت ہوتے ہیں ۔ اور ان کو بھرپور طریقے سے استعمال کرتے ہوئے خود کو مستحکم کرتے ہیں ۔

نفرت کا کاروبار کرنے کے لیے سب سے پہلا اور بڑا اصول ہے
"Divide and Rule"
یعنی توڑو اور حکمرانی کرو
سوپر پاور بنا بیٹھا امریکہ ، اس کا معاون اسرائیل اور باقی نیٹو افواج بھی اسی پر کار بند ہیں ۔
اور مسلم دنیا بھی اسی کی لپیٹ میں ہے ۔
مثال کے طور پر دیکھیں کہ اسماعیل ہنیہ کو اگر کسی سنی اکثریت کے ملک میں نشانہ بنایا جاتا تو اتنا فائدہ نا ہوتا جتنا ایک شیعہ حکومت کے انڈر ملک میں نشانہ بنا کر ہوا ۔
اسی طرح سے انقلاب ایران میں جب ایران سے بادشاہت کا خاتمہ ہوا تو اس کا اثر پوری مسلم دنیا تک گیا اور سعودی بادشاہت کے بھی کان کھڑے ہو گئے
اس کے لیے انہوں نے پھر اپنی پروکسیز کو تیار کیا اور اس کو افغان جنگ میں شامل کردیا ۔ دوسری طرف امریکہ نے جب سویت یونین کو آگے بڑھتے دیکھا بظاہر روسی افواج کا مقابلہ کرنے کی غرض سے ہی وہ افغان جنگ میں کودے لیکن وجہ وہی تھی کہ سویت یونین اور کمیونزم کا زور توڑا جائے ۔
اس پر پھر سعودیہ اور امریکہ کا گٹھ جوڑ ہوا ۔
انڈیا سے رابطہ کیا گیا تو انہوں نے اس لڑائی میں شامل ہونے سے صاف انکار کردیا

لیکن جب پاکستان میں ضیاء الحق سے رابطہ کیا گیا تو پہلے منع کردیا گیا اور پھر نئے صدر کے آتے ہی اور انقلاب ایران کے اثرات پاکستان تک پہنچنے کے خدشے کو جواز بنا کر انہیں بھی راضی کر لیا گیا تھا ۔
ذوالفقار علی بھٹو چونکہ شیعہ تھے اور کافی مقبول بھی تو اس مقبولیت کے مقابلے کے لیے بھی کوئی چاہیے تھا ۔ اور اس کے لیے جھنگ سے ایک حق نواز جھنگوی نامی شدت پسند مولوی کا انتخاب ہوا ۔ اور دوسری طرف جامعہ حقانیہ اکوڑہ جسے مجاہدین کا گڑھ کہا جاتا ہے ۔

"1980 سے 2000 تک پاکستان میں مدارس کی تعداد"

"1980 سے 2000 تک پاکستان میں تقریباً 20,000 دینی مدارس قائم ہوئے۔"
یہ دور مدارس کی تعداد میں نمایاں اضافے کا دور تھا، جس میں مختلف مسالک کے مدارس شامل تھے۔
"1980 سے 2000 تک مدارس کی تعداد میں اضافہ"

"1980 سے 2000 تک پاکستان میں دیوبندی مسلک کے مدارس کی تعداد میں سب سے زیادہ اضافہ ہوا۔"
اس دور میں دیوبندی مدارس نے دینی تعلیم کے میدان میں نمایاں کردار ادا کیا اور ان کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔
"افغان جنگ میں مدارس سے طلبہ کی شمولیت"

"افغان جنگ کے دوران، خاص طور پر سوویت افغان جنگ (1979-1989) کے دوران، دیوبندی، اہل حدیث، اور دیگر اسلامی مدارس سے طلبہ نے بڑی تعداد میں شمولیت اختیار کی۔"

ان مدارس نے جہاد کے لیے نوجوانوں کو تیار کرنے میں اہم کردار ادا کیا، اور بہت سے طلبہ نے مجاہدین کے طور پر لڑائی میں حصہ لیا۔ دیوبندی مدارس، خاص طور پر، اس جنگ میں نمایاں طور پر شامل تھے، کیونکہ انہوں نے اسلامی تعلیمات کے تحت جہاد کی ترغیب دی۔

نیو کلئیر پروگرام کا آغاز تو تقریباً 1963 میں ہو گیا تھا ۔ اور اس پر ردعمل کا سامنا بھی کرنا پڑا خاص کر امریکہ کی جانب سے کہ اس نے جواز پیش کیا اسے روکا جائے تاکہ اس کا غلط استعمال نا ہو
جبکہ وہ خود اس سے پہلے ناگا ساکی اور ہیرو شیما پر نیوکلیئر پاور کا غلط استعمال کر چکا تھا ۔
لیکن جب 18 مئی 1974 کو انڈیا نے اپنا پہلا ایٹمی تجربہ کیا تو پاکستان میں بھی نیوکلیئر پروگرام میں تیزی آ گئی ۔ جس میں بھٹو صاحب نے کافی چستی دکھائی ۔ لیکن ان کو یہ دیکھنا نصیب نا ہوا کہ پاکستان دنیا کا پہلا اسلامی جوہری ہتھیار بنانے والا ملک بنتا دیکھیں ۔
4 اپریل 1979 کو ضیاء الحق کے دور میں انہیں پھانسی دے دی گئی ۔
یہ وہ وقت تھا جب کمیونسٹ تحریک سویت یونین کی فوجیں افغانستان میں آگے بڑھ رہی تھی ۔ اور جیسا کہ ہم گزشتہ قسط میں بتا چکے ہیں کہ انقلاب ایران کے اثرات بھی مسلم دنیا خاص کو سنی اکثریت والے ممالک میں موجود شیعہ مسلک کے افراد کو ایک نیا ولولہ دے رہے تھے ۔ جس پر سعودی بادشاہت اور ضیاء الحق کو خدشات لاحق ہونے لگے کیونکہ بھٹو کی پھانسی کے بعد اقتدار کو طول دینے کے لیے کوئی اور جواز موجود نہیں تھا سوائے اس کے کوئی بڑی وجہ سامنے لائی جائے ۔
بھٹو کی پھانسی کے تقریباً ایک ماہ بعد کی بات ہے جب امریکی صدر جمی کارٹر نے جنرل ضیاء کو 400 ملین ڈالر کی امداد کی پیشکش کی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد انڈیا کا جھکاؤ کمیونسٹ ممالک کی طرف تھا ۔

اور پاکستان کی گرتی ہوئی معیشت کو امداد کی ضرورت تھی ۔لیکن اس کی باوجود ضیاء الحق صاحب نے اس آفر کو ٹھکرا دیا اور ساتھ کہا کہ
It's not peanut 🥜
یہ مونگ پھلی نہیں ہے

چونکہ جمی کارٹر کے مونگ پھلی کے فارمز تھے ۔
کچھ عرصے بعد جمی کارٹر کا ہی حمایت یافتہ صدر رونالڈ ریگن نے دوبارہ آفر دی اور اس بار قبول کرلی گئی ۔
اس پر ریسرچ کے دوران میں ایک آرٹیکل پڑھ رہا تھا جس میں ایک جملہ بہت زبردست مجھے ملا کہ
"اس سے پہلے امریکہ اور پاکستان کے درمیان معاشقہ چل رہا تھا اور اب شادی ہو گئی"

امریکہ نے پاکستان کو U.S Aid کی صورت میں
3 بلین ڈالر دیے معیشت کی بحالی کے لیے
2 بلین ڈالر دیے فوجی امداد کے طور پر
اور
2 بلین ڈالر افغان مجاہدین کی تیاری لیے ۔
یہ امریکہ اور پاکستان کی شادی تقریباً 80 کی دہائی کے آخر تک چلتی رہی ۔
اس دوران پاکستان میں تھوک کے حساب سے مدارس وجود میں آئے جو کہ اصل میں افغان جنگ کے لیے افرادی قوت مہیا کرتے تھے اس میں فائننشل سپورٹ تھی امریکہ اور سعودیہ کی اور ٹریننگ دے رہے تھے جامعہ حقانیہ اکوڑہ، داعش اور القاعدہ ۔ 80 کی دہائی کے اواخر میں سویت یونین ٹوٹ گئی اور وہ افغانستان سے نکل گئے ۔ اس کے ساتھ ہی امریکہ کی دلچسپی بھی پاکستان میں ختم ہو گئی ۔ پھر انہیں پاکستان کا جوہری پروگرام پھر سے کھٹکنے لگا ۔
جارج ڈبلیو ایچ بش نے امریکی امداد روک دی ۔

لیکن جو 10 سالوں میں مدارس نے مجاہدین پیدا کئے تھے ان کا والی وارث کوئی نا رہا یہ بے سروپا یونہی رہے ۔ یہاں تک کہ
9/11 والا واقعہ رونما ہو گیا اور پھر امریکہ نے اپنی چالیں چلنا شروع کردی ۔
اب اس نے دوبارہ پاکستان سے الحاق کیا کہ اب ہم
War Against Terror
کریں گے ۔ اس کے لیے جارج ڈبلیو بش نے اس وقت کے چیف پرویز مشرف کو اعتماد میں لیا وزیرستان میں آپریشن ہوتے رہے ۔ جو کہ 2009 - 10 میں ہونے والے ممبئی تاج ہوٹل حملے کے بعد تیز ہوگئے ۔ اس کے لیے پاکستان سکیورٹی فورسز نے آپریشن راہ راست لانچ کیا ۔ جس کی ایکسٹنشن ضرب عضب تھا ۔
ان آپریشنز میں وہی گندے انڈے پھوڑے گئے جو امریکن خوراک سے خود ہی ملاؤں کے نیچے رکھ کر بچے نکالے گئے تھے ۔
یہاں سب کو اپنے اپنے اہداف ملتے رہیں ہیں ۔ مگر نقصان پھر وہی عام لوگوں کا ہوا ۔ کئی نوجوانوں کی جوانیاں ، کاروبار ، تعلیم ، مستقبل داؤ پر لگ گیا ۔ اور اس کے پیچھے موجود اس کی نسلیں بھی تباہی کا شکار ہو گئیں ۔
امریکہ ، سعودیہ عرب ، ایران ، پاکستانی ملٹری اسٹیبلشمنٹ ، اور کچھ حد تک افغانستان خود بھی فائدے میں رہے ،ترقی کر رہے ہیں تعلیم میں معیشت میں
مگر
عوام الناس ہمیشہ سے گھاٹے میں رہے ہیں کہ جب تک وہ ان موقع پرست سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف اٹھ کھڑے نہیں ہوتے ۔

ختم شد -----

" یہ میری غزلیں یہ میری نظمیں "

مدحت رسول اللہ ﷺ

سجود اس میں ، قیام کیا ہے
سنو محبت کا پیام کیا ہے
رکی ہے دھڑکن جو اس جگہ پہ
دیکھ لو تم یہ مقام کیا ہے
حضور کا تجھے محب بنا دے
بھیج دیکھو ، سلام کیا ہے
یہ ادنی خادم کیا ہی جانے
در نبی پہ حاضری کا اہتمام کیا ہے
میں عاصی خاک میں بسنے والا
نا سمجھوں رفعتِ خیر الانام کیا ہے
میں تڑپوں بلکوں روؤں ہر دم
وہ جانتے ہیں علاج مرض تمام کیا ہے
اے خدا پہنچا دے ان تک
احوال اطلس غلام کیا ہے

منقبتِ اصحابِ رسول ؓ

اصحاب رسول پاک کی مدح سرائی کیا کروں
ڈرتا ہوں ہو نہ جائے ہرزہ سرائی کیا کروں
ابو بکر ،عمر،عثمان،علی سب جواہر نایاب
منکر و بے خرد و عقل کے ذہن کی کھدائی کیا کروں
میری سلب میں چلے گی حب علی تا ابد
بلند مقام اصحاب کا کوہ پیمائی کیا کروں

یاصاحبی السجن
اے ! مرے قید خانے کے رفیقو

اے میری قید تنہائی کے رفیقو!
آؤ ان بے جا خواہشات کے چنگل سے آزادی پائیں
نا امیدی ، دکھ ، درد ، الم کے جنگل سے آزادی پائیں
وسیع میدانوں میں نکلیں یہاں کچھ سادہ لوح بچے
جوانی کی لذتوں ، خواہشوں ، ترجیحات سے نا آشنا ہیں
اے ! مرے قید خانے کے رفیقو ، انہیں نا آشنا ہی رکھیں

یا صاحبی السجن
جب تو نکلے اس قید خانے سے
شہنشاہ معظم سے ذکر میرا کرنا
کہنا شرمندہ ہے اپنے کیے سب اعمال پر
کہنا اک بار نظر کیجئے فقیر کے سوال پر
سات دبلی گائیں کھا بھی چکی ہیں توانا کو
میری سب بھری بالیاں جھڑ بھی گئی مٹ بھی گئی

یا صاحبی السجن
یہ میرے دو رفیق سجن
کون جانے، کیا ہوگا
کون مئے پلائے گا، کون چیلوں کا شکار ہوگا
کون جانے، کیا ہوگا
کنویں سے نکل کر تخت پر بیٹھوں یا تختہ ہو جاؤں

شہر اقتدار کی بلند و بالا عمارات کے بیچ و بیچ
عمائدین شہر کے فضلات کی نکاسی کے آب رواں کے کنارے
جھونپڑیوں کی اک طویل قطار بستی ہے
جن کے باسی کم ذات ، کم عقل ، بے وقعت و ناکارہ اجسام
جاہل ،اجڈ ،غلیظ کچرے کے ڈبوں میں پلنے والے
بتاؤ تو کیا یہ انساں نہیں ہیں؟
سانس لیتے ، وجود رکھتے ،طاقت کی ایوانوں میں بڑبڑاتے
تمام شخصوں سے پوچھتا ہوں
بتائیں ہم کو تم میں ، ان میں فرق کیا ہے
وہ بھی کچرے میں رہنے والے
تم بھی کچرے میں رہنے والے
وہ بھی غلاظتوں سے کھانے والے
تم بھی غلاظتوں سے کھانے والے
وہ بوجہ مجبوری جو کھائیں غلاظت
سمجھے ہو تم ان کو غلیظ
تم بلا وجہ جو کھاؤ رشوت
کیوں نا سمجھیں تمہیں خبیث
آخر میں جو سمجھا ہوں
وہی کہتا ہوں میں آخر
میلے پھٹے کپڑوں میں دل شیش محل ہیں
اجلے دھلے کپڑوں کے پیچھے شیاطین دل ہیں

شہر ، شہر کے گردا گرد پہاڑوں کی اک قطار
پھول ، پھولوں کے گردا گرد تاروں کی اک باڑ

جیسے دل کوئی مقید ہے ہڈیوں کے پنجر میں
خون ، نسوں میں جیسے طغیانیوں کی اک آبشار

میں نے اسے دیکھا ہے چمکتے ہوئے سورج کی طرح
سورج ، سب سے پہلے، سب سے اوپر ، صبح منہ نہار

جتنا بھی تھا جنوں عشق کا سب ہوا تمام
تیر ، پیوست ہوا سینے میں ،رہا، نا آر پار

اب کے دیتا ہے مجھے اندر سے صدائیں یوں
دل ، جیسے کوئی بچہ ، سمجھدار ہوا ہشیار

اب کے عزیز بھی کہتے ہیں ،کیا ہوا اطلس
نا بلد ہوا ، بیکار ہوا ، بگڑا ،بگڑ کے ہوا ناہنجار

تمہارے لمس سے زندہ ہیں ہوائیں
جو بھی ان میں سانس لیتا ہے تمہارا ممنون ہے

یہ پانی جو تمہارے بدن سے مس ہوکر زمین میں جذب ہوتا ہے
اس سے اگنے والی فصلیں قوی جثہ نفوس پیدا کرتی ہیں

تمہارے آنکھوں سے تقویت پا کر
دنیا کے سبھی حسین منظر پیدا ہوتے ہیں

تیری آواز سے ہی سیکھتے ہیں پرندے چہچہانا
تیرے غضب سے ہی درندے حیات پاتے ہیں

دین بیزار

رات کے پچھلے پہر اٹھ کر کہنے لگا اک دین بیزار
اس وسیع و عریض کائنات میں یہ کیا ماجرہ رب پروردگار
بھوکے کے پاس روٹی نہیں ، ننگے کے پاس کپڑا نہیں
مفلسوں سے ڈرتے ہیں امراء ، امراء سے ڈرتے ہیں مفلس
تنگ دست و گریباں چاک ، پشیمان و پریشاں لوگ
نا جینے کا ہے یارا ، نا مرنے کے ہیں اسباب میسر
دولت کے ایوانوں میں نت نئے تجربات ہیں ہوتے

چوچو کا مربہ ہیں بناتے ، مجربات ہیں ہوتے
نا دست مسیحائی کا یارا ، نا یداللہ معجزات ہیں ہوتے

کم سنوں کو مارتے عصمتوں کو لوٹتے مثل فرعون
کوئی مرد موسیٰ جو جگانے کو اٹھے تو ان پر
شعلہ فگن ، سحر زدن ، کوڑھ بدن ، انگارا ہیں ہوتے

ہم کو جلدی ہے کچھ اس برزخ سے گزرنے کی
ورنہ اطلس نہیں کہ یوں پشیماں ہیں ہوتے

بے ربط کہانی

میری نظموں میں عورت کا تصور ہی نہیں
کھینچے جو مصوری میں ننگ نساء
میرے قلموں میں یونانی مصور ہی نہیں
میری نظمیں تو ہیں خالق کی مرہون عطا
نظر آئی نا مجھے مصر میں کوئی قلوپطرہ
چاک ہو کیونکر نیل و فرات
نا ہو جب تلک ہاتھوں میں موسیٰ کا عصا
میرا گریہ تو ہے سارا یوسف کے لیے
کیا پڑی ہے مجھے جو کروں معلوم
کیا بنا ان کا جو کٹی تھی انگشت نساء
زلیخا بھی میرے خوابوں میں نہیں آنے والی
میرے خوابوں میں مسکن ہے وہ مسلسل کی قحط سالی
میرے خوابوں میں تو یوسف ہی زنداں میں پڑا ہے
شاہ مصر سوتا نہیں اور نا کوئی یاران زنداں ہے
میرے خوابوں میں شمس و قمر اور انجم
کہاں مسجود ہوں؟ مجھ سا بے خواب ملزم

وہ جس کا باپ مارا گیا
نعرہ تکبیر پڑھ آنکھوں کے سامنے
اس طفل ناتواں کو سمجھائے کون پھر
وہ رب العالمین بے شک بڑا ہے مگر
ان قاتلوں کا بڑا نہیں
پوچھتے ہو مجھ سے
میرا مذہب و مسلک ہے کیا
بھوک میں روٹی کیوں
پوچھتے نہیں مجھ سے
یہ دنیا بھی کوئی دنیا ہے
جس میں آزادی سکوں ہی نہیں
وہ دنیا بھی کیا واقعی دنیا ہوگی
نظروں کا دھوکہ یا کوئی فسوں نہیں
ایسا نظروں کا فسوں کہ جس میں
ہر رکھنے والی چیز کو کافر سمجھے
کافر بھی ایسا ویسا واجب القتل جیسا
اور پھر نعرہ تکبیر پڑھ
چشم فرزند کو تڑپتا ہوا پدر دکھے
ایسی آنکھیں پھر کیونکر سمجھیں
خدا مہربان ہے ، رحیم ہے ، کریم ہے
اسے معصوم آنکھ کو کیا معلوم
قاتل ہی فقط کمین ہے ،ملعون ہے ، رجیم ہے ،

جفاکار

میں بھی جفاکار ہوں کسی کا
اس کو بھی جو ملا جفاکار ملا
اب مشکل پڑی غضب کی مجھ پر
کیسے اسے بتلاؤں؟ میں وہ جفاکار نہیں
جو لگے ہیں زخم تجھے بیشتر
میں آیا نہیں انہیں کریدنے
جو وبائے جان لیواؤں سے بچ گیا
میں وہی مسیحائے بدنام و بے رحم طبیب ہوں
اے میری جاں ذرا ، میرے ید بیضا کو ذرا دیکھ
طور سے پلٹے موسی کو نا مصر سے آیا جان
کنوئیں میں پڑے شخص کو نا بے وقعت سمجھ
اسے مصر کے تخت پہ بیٹھا ہوا یوسف جان
گر تجھے یقین نا آئے تو میری یہ دلیلیں ساری
آتش نمرود میں ڈال اور ان کی سچائی جان

ہم کہانی کار ہیں کہانی ہی لکھیں گے
بوجہ بے روانی کے مع روانی ہی لکھیں گے
کٹتا ہے تو کٹ جائے سر اپنا جبیں سے
مگر صاحبان ایواں کی بد عنوانی ہی لکھیں گے
اترے تیرے بالوں میں چاندی یا ہو ہاتھوں میں ریشہ
تیرے ضعف کو ضعف نہیں جوانی ہی لکھیں گے
خنجر بھی ، دل بھی لے اے ستم گر
میرے قاتل تجھے قاتل نہیں نادانی ہی لکھیں گے
نہیں حاصل تو لاحاصل بھی ہے حاصل
اس ادھوری کو بھی مکمل کہانی ہی لکھیں گے
میری میت پہ جو آئے گی زلفوں کو بکھیرے
دیکھنے والے تو سبھی میری دیوانی ہی لکھیں گے
پیاسا جو کوئی صحرا میں مر جائے گا شاعر
اس کی نسلوں میں سبھی افسانہ پانی ہی لکھیں گے
اے میرے عدو تیرے ہر وار کے بدلے میں سدا
جب بھی لکھیں گے تیرے مقدر میں شادمانی ہی لکھیں گے
یہ عام سے دکھ عوام کے دکھ ہیں
خود نا بھی کہیں اطلسؔ کی زبانی ہی لکھیں گے

جو ہے لاچاری دنیا میں میرے ساتھ وابستہ
بعد مرنے کے بھی میرے ساتھ رہے گی
سر حشر پکارے گی مخلوق خدایا !
اور میرے لبوں پہ تیری ہی پکار رہے گی
جو سہہ کے آئے ہیں دنیا میں
کیا پھر وہی عذاب ہوگا ؟
دی گئی تھی جو اداسیاں ، تنہائیاں مجھ کو
کیا ان کا بھی حساب ہوگا ؟
لایا جائے گا مجھے پیش خدا جن اعمال کے سبب
میری آنکھیں ہی تو چندیا جائیں گی جمال کے سب
ہوگا جسم ناتواں میں لرزہ طاری جلال کے سبب
مجھ سا عاصی بھی بخشا جائے گا سرور کمال کے سبب
ہر طرف صدائے کبریا ہے ہیبت ہے طاری
آج عالم الغیب سے غیب کا پردہ اٹھا ہے
آئے ہیں سب سایہ رحمت میں خدائے ذوالجلال کے سبب
وہ غالب ہے دنیا پہ اور اس کی مغلوب ہے دنیا
خالق ہے سب جہانوں کا اور مخلوق ہے دنیا
مگر ! مالک و مولا عمر بھر کی اداسی کا صلہ کیا ہے
فردوس بریں ہے یا حیات جاویداں ہے
کچھ ارشاد ہو حاضر ہے بسر چشم یہ بندہ
اعمال برے ہیں ، آیا شرمندہ و پراگندہ
عاصی کو آس تیرے ہی در سے
آیا خالی لئے دامنِ اطلس ہے گھر سے

نفرتیں

صدائیں کسی بے کس کی گر نہ سنی جائیں گی
بلائیں کسی حسین دلرُبا کی گر نہ لی جائیں گی
دوریاں دو دلوں کی گر نہ مٹائی جائیں گی
سرحدیں دو گھروں کی گر نہ اٹھائی جائیں گی

پھر ڈرنا اس وقت سے
جب محبتیں ختم ہو جائیں
نفرتیں عام ہو جائیں
تمہارے گھر کی چڑیا ادھر ہی مرے گی
میرے گھر کی چڑیا ادھر ہی مرے گی
وہ ہمارا جو سانجھا پیڑ ہے نا
کٹ گرے گا اور ڈھیر ہوگا
ساتھ میں بھی کٹ مروں گا
تو بھی کہیں ڈھیر ہوگا

صدائیں کسی بے کس کی گر نہ سنی جائیں گی
بلائیں کسی حسین دلرُبا کی گر نہ لی جائیں گی

اڑتی ہو یہاں خاک، سر وہیں پر لے جاتے ہیں
کرتے ہیں محبت ہنس ہنس کے پھر آنسوے بہاتے ہیں
ارے ہماری کیا بات کرتے ہو ہم تو اجنبی ٹھہرے
یہاں تو شہر کے باسی بھی پتھر ہی کھاتے ہیں

جب بھی اٹھا ہے مرا قلم ترے نام سے آگے
فوج در فوج ہی پائی آلام کی آگے
یہ شیریں تکلم ، یہ مسحور سی باتیں
سب سادہ ورق لگتے ہیں ترے کلام سے آگے
وہ ادائے بے رخی ، وہ ستم نارسائی
قتل ہوئے ہیں ترے در و بام کے آگے
دن تو کٹ ہی گیا جیسے تیسے
پھر دورِ درد ہوا شروع شام سے آگے

یہ جو ڈس رہے ہیں سر راہ ہمیں
یہ سانپ اپنی ہی آستیں کے پالے ہوئے ہیں

خود ہی قاتل بھی ،مظلوم بھی شاہ بحر و بر بھی
حیران نا ہوئیے کہ ایسے بھی کردار نرالے ہوئے ہیں

جوت بجھ نا جائے پیا ہماری
آؤ کہ نگری اندھیر ہے ساری
ارمانوں کے دیئے بجھ گئے
زندگی نے گٹھڑی باندھ کی تیاری

اک ابلیس کے ڈسے ہوئے فردوس سے نکلے
اپنے حواس کو کھویا ہم ہوش سے نکلے
اب ہر سمت ہیں ابلیس ،جائیں کہاں ؟
بے چینیاں چھائی ہیں ، چین پائیں کہاں ؟

ابلیس نے کیا وار ہے کاری ، آدم کی نسل بدل ڈالی
اس کی ہے اپنے اجداد سے یاری ،آدم کی نسل بدل ڈالی
کہیں چوری کہیں ڈاکہ کہیں چھاؤنی کہیں چھاپہ
سب کی اس سے ہے بیزاری ، آدم کی نسل بدل ڈالی

اک تمنائے دل ہو تو بھر بھی جائے دل
لاکھ تمناؤں کا گھر خالی نہیں ہوتا
ہیں تضادات سے گھرا ہر معمہ اداسی
لاکھ بیت الحکماؤں سے گزرا حل نہیں ہوتا

آنکھ چھلک چھلک یہ کہتی ہے
سانس بلک بلک یہ کہتی ہے
دوریاں مٹائے گا
قربتیں وہ لائے گا
آنکھ پھر سے نم نا ہو
اور کوئی غم نا ہو
بال جھٹک جھٹک یہ کہتی ہے
سر پٹک پٹک یہ کہتی ہے
روشنی وہ لائے گا
اندھیرے کو مٹائے گا
گھٹا گھٹک گھٹک یہ کہتی ہے
بجلیاں چمک چمک یہ کہتی ہیں
طاقتوں کو سمجھ تو
بازیوں کو پلٹ تو
تاریخ جرخ جرخ یہ کہتی ہے
عقل پرکھ پرکھ یہ کہتی ہے
نا کوئی چیز ہے مستقل
نا کوئی غم ہے جاویدا

حسن و عشق و مستی میری دسترس میں ہے
تری یہ ہستی میری دسترس میں ہے
خود ہی رہا صحرا نشینوں کی طرح
جام و سبو و مینا و مستی
مری دسترس میں ہے
تیغ بار نینوا سے بچ سکے تو کس طرح ؟
ان خونخوار نینوا کی تیر دستی شش جہت میں ہے

Thus Spoke Zarathustra

اتر کر پہاڑ سے زرتشت نے کہا
پہلی جنگ میری بھوک کے خلاف تھی
دوسری میں مجھے جہالت کو للکارنا ہی پڑا
مفلسوں نے کہا کہ خدا ہی کچھ کرے تو کرے
آخری جنگ میری پھر خدا کے خلاف تھی
غضب کا معرکہ ہوا اور خدا کو مارنا ہی پڑا

" اساں سیوک بولی ماں دے"

اڈیکاں تیریاں چے زندگی گزاری
تے آخر بلاوا آ گیا
لگے زندگی تو موت پیاری
تے آخر بلاوا آ گیا

یاداں تیریاں دی گٹھڑی بن کے
سجناں نوں ای اساں رب من کے
کیتی ملنے دی خوب تیاری
تے آخر بلاوا آ گیا

پچھیا خدا نے کیہ لیایاں ایں
زندگی چے دس کیہ کمایا ایں
میں وکھائی تیری صورت پیاری
تے آخر بلاوا آ گیا

موت ٹکری تے تینوں میں ملیا
صدیاں دا کملایا پھل ویکھ کھلیا
ہجے رج کے نئیں صورت نہیاری
تے آخر بلاوا آ گیا

گوٹا کڈدی تے لیکھا بناؤندی
کر چیتے چت وچ سجن پکاؤندی
سنجی رہ گئی اے شگھنا دی پھلکاری
تے آخر بلاوا آ گیا

بریاں نال جو چنگا کیتا اوں چڑیاں دی ڈار
چنگیاں نال جو برا کہتا چنکاں نکلن ہزار
دو ہتھ میری جیونی تے سو وگیاں دی چاہ
کلی میری لکھا تے اگ پرونے بار
مرن توں پہلاں مرنا آپاں تے موت نوں دینا مار
موت حیاتی اینجے رلسی جیوں گلاباں خار
اساں اندرجنگاں لڑیاں تے باروں رئے شانت
ساڈا بار رئیاں نکھریا تے اندر لیا مار
اسی بولے ، اساں ای بولناں ، ہر بند کواڑ اے کھولنا
کفناں وچوں بولدے زخمی اطلس وجن کنیا چار

شو کمار پیارے وانگوں جوبن رتے مرنا چاؤنا
جوبن رتے عاشق مردے میں وی عاشق بننا چاؤنا
جوبن رت ہنڈائی ایتھے جیویں ہانڈی چلھے
میں ہاں پتھر بنجر نمانڑاں مٹھی چاشنی بننا چاؤنا
ایس جوبن رت ہڈ نیں گالے ماس ہٹایا کنگھیاں
ننگی میری روح دے اتے موت دا چگا پانا چاؤنا
ایس جہانے مڑ نئیں اونا ایس جہانے کجھ نئیں کھٹیا
ہن زری پوشاکا کج نئیں منگدا گل وچ کفنی پانا چاؤنا
جوبن رتے مرنا ایتھے جیویں چودھویں راتی چن کلمونہ
ہر ویکھن والی اکھ نوں خون دے اتھرو رونا چاؤنا
جوبن رت دے ہنڈ ہنڈائے پیری پائے چھالے
جوبن رت دے راہے ہن میں چھالے پانا چاؤنا
جوبن رت نیں اکھیاں وچوں رت وگائے
جوبن رتے مر کیہ ہن میں رُت نوں رَت رلانا چاؤنا
اکلاپیاں ساڈا رَت اے پیتا جوبناں والی رُت نا جُوئے
ایس عالم توں اُک کے ہن اگلا عالم ازمانا چاؤنا
جوبن رت دے سو سیاپے رت مک جاندی اے نئیں مکدے
جوبن رتے مر کیہ اطلس سب سیاپے مکانا چاؤنا

اک نمانڑا شاعر لفظاں باج کیہ دے سکداں میں
پر لوڑ پین تے اس دھرتی نوں اپنی جان وی دے سکداں میں
لوآں کنڈے کج نئیں ہوندے بوہتے بندے کیہ ہوندے
ابابیلاں توں ہاتھی والیاں نوں شکستاں وی دے سکداں میں
تیرے دعوے تے اچیاں بانگاں سب جاندا ہاں
تیرے ہتھوں کھنڈی کھو کیہ تیری چتا وچ ڈانگاں دے سکداں میں
سانوں موت تو ، توں ڈراویں ساڈی موت دے نال اے یاری
مرے ہویاں نوں موت نا آوندی ،موت نوں مات وی دے سکداں میں
اے دھرتی ساڈی ماں اے اطلس ماں تو ودھ کوئی ہور نئیں ہوندا
جہڑا ایدر چاتی پاوے میں اکھ چے انگل دے سکداں میں

اک شہید فوجی دی ماں نوں پچھیا
دس نی مائیں جنگ کی ہندی اے
ماں نے دسیا
پترا ایس دا کوئی ناں نئیں ہوندا
ایس دا کوئی منہ نئیں ہوندا
اے کم ذات کمینی ڈین پرانی
ماواں کھانی ،مواں کھانی
ماواں کولو پتر کھو کے
منہ پترا دے کھا جاندی اے

اکو وا دا رخ نا ویکھیں
اکھیاں وچوں ڈلے اتھرو ای نئیں
خون وچ رلیا تھوک وی ویکھیں
ہتھ وچ چور دے کلی روٹی نئیں
اودھے ٹڈ وچ نچڑی پکھ وی ویکھیں
جہڑے میں نوں ڈیگنا چاہندے
آپے جانگے جھک وی دیکھیں

مٹی دے قلبوتے اندر
جد اپنی روح نوں پھوک کے اس نیں
نوریاں کولوں سیس نوائے
مٹی دے قلبوتے اندر
اک چنگاری جنم لیا سی
سب نوں سیس نوایا ویکھن
رب نوں سیس نوایا ویکھن
اس دی عادت جس نیں پائی
اوہی اس نوں مندا سمجھے
بندہ وی بندے نوں بندہ سمجھے
اس سے نیرو ابلیس نیں لایا
کیرا پاہ کیہ ایس جنتوں کڈایا
اوہوں اندری بیٹھی پھوک نیں
اینوں شداد ، نمرود تے فرعون بنایا
رب بننے دی چاہ نے اینوں
بندیو ابلیس بنا دتا اے

مٹی دے قلبوتے اندر
نرخ دا پانبھڑ لا دتا اے
ایسے پانبھڑ دی روشنائی
مینوں وانگ کوہ طور جلا دتا اے
میں وی تینوں پچھداں ربا
اے اندر میرے کیہ پیا ہوندا
اے کیسی پھوک توں ماری سی
میرے آگے جھک گئے سارے
نوری پاویں ناری سی
پر ہن او گل نئیں دسدی
گل وی ہن ہندا ول نئیں دسدی
اک واری فیر میں
مٹی دے قلبوتے اندر
اوہی پھوک وسانا چاہنا
نوری ناری تے سب جگتاں توں
اپنے آگے سیس نوانا چاہنا
ایس مٹی دے قلبوتے چوں
ہن میں جان چھڑانا چاہنا

پچھلی پہری رات دے ویلے
اک خیال ستاون آیا
مستاں والی نیندوں مینوں
کنوں پھڑ جگاون ایا
سن وے شاعرا کلی پلیتئیا
اک کنجری دا دکھ نا سمجھیں
ایہو جئے نوں چلے پاواں
زندگی کدے وی کھیڈ نئیں ہوندی
پھلاں اتے سونی آں میں
پھر او پھلا والی سیج نئیں ہوندی
عطر ، فلیل تے خوشبوؤں لا کے آون والے
اندروں گندے، کوجے تے لُچے بندے
سانوں آ کے کنجری کہندے
کنجرو سانوں کنجری کہن توں پہلاں
اپنے اندری جھاتی پاؤ آپے کیہ جے
میں ویچاں تے جسم فروشی
آپا ویچو تے بزنس ڈیل اے
تھانے کچہری تے کوٹاں دے وچ
الیکشن اسمبلی تے ووٹاں دے وچ
بندے ویچو بغیر ضمیروں جسماں والے
دسو ہاں فیر وڈے کنجر کہڑے ہوئے ؟
سانوں کنجری کہن والیاں نوں
اپنے اندری ویکھنا پینا
تد تائیں سانوں انسان ہی سمجھو

وچ کراں دے جھاتے پاون جے نیویں ہووے کند
کدے نشانہ تھاں نئیں لگدا جے کچی ہووے کمند
ویلا ریت دے وانگر ہتھوں نکلی جاندا
اگلے کری پچھ پتیت نا ہوسی کر ہتھ پرن پروند
عقلاں سانوں کملیاں کیتا ، اساں کملیاں دے پردھان
جہڑا سانوں ویکھے سن لئے او سمجھے عقلمند
دودھ دی کوئی ذات نا ہوندی ، اے اکلوتا پت
ایسدے بچے آگے وددے کھا مدھانی دی چھنڈ

ربا مینوں چپ سکھا دے
میں وی سکھی رہنا چاہنا
جو وی دیکھاں جو وی ہووے
چپ چپیتے سہہ جاواں میں
کجھ نا بولاں کجھ نا آکھاں
ربا مینوں چپ سکھا دے

جیدے وچ پچھ پرتیت نئیں
او کوئی پریت نئیں

سجناں دے ہاریاں جیت ہووے
او ہار کوئی جیت نئیں

ایسی کھیڈ محبتاں کھیڈیئے
جدے وچ دوہاں دی جیت ہووے

آزاد وستی دے رہن والے
آزاد ڈکھدن آزاد کوئی نئیں
آباد وستی دے رہن والے
آباد ڈکھدن آباد کوئی نئیں
بکھ نیں ماواں دے لال کھجے
بکھ نیں پیئو کوں زہر دتے
دو ڈنگ دی روٹی نیں ڈنگ لیا اے
غریب ، غربت تے بکھ دا ناطہ
ابدو لکھیا ایں بکھاں لیکھے
ربا آ کے توں آپ ویکھیں
بال روندین ، چانگاں پاندن
آنڈ گوانڈی ہانڈی رندن
ہواڑ پاروں ڈھڈ لوندن
بکھ جد جر نا ہووے
غریب غربت توں وت روندن

اک دلبر ، اک دل دا جانی ، تیجا سوہنڑاں ڈھیر جھانو
میڈا ڈھول مٹھل ، کر جان پتھل وسدا دور زمانو
میں دلبر دی ، دلبر میرا ،تیجا کون جانو
مک ویسن ادھا ساہ اطلس دے جد مکراں کدی زبانو

یار ڈٹھا میں جگ توں سوہنڑاں
تے وچ سکھیاں کھلی اٹھلاواں
اسدے قدمی نبھسی حیاتی میری
تے میں ہور کدے ول جاواں

اے سوہنڑاں میرے لیکھی آیا
تے میں خاک قدماں دی نینی سرمہ پاواں

جے کر سوہنڑاں اک نظر تکے تاں
جگ وچ نظر او پاواں

میرے نینی ہجر ترے دا دریا وگ وگ جاوے
جو عشق مرے نوں کنڈے لاون ، او بیڑیاں روز بناواں

ہجر ترے دا سول مرے سینے کھبیا
وصل سجنا دی ترکھڑی نوک نال کڈھ واواں

ویندے پانیاں چے گلاں گئیاں رڑ نی
جھیڑیاں توں نبھان کیتیاں
لگا موت دا اڈیکا تے آساں گئیاں مڑ نی
جھیڑیاں توں نبھان کیتیاں
رئے وسدی تیری وڈی جھوک نی
پاویں ساڈی کُلیاں نوں اگ لگ جائے
رینا ہاسے تری زندگی چے ویکھیر دے
ساڈے رونیاں دی پاویں حد مک جائے
ویندے پانیاں دی ندی گئی سک نی
تے پکھیرو سارے پیاسے مر گئے
نال ڈاریاں دے بدیس سیگے کُمدے
شوہدے شکاریاں نیں جال سٹ لئے
پَر کٹ کے تے روح پنجرے پائی
گلاں گلے وچ دبیاں ساڈے نال کیہ بیتاں
جھیڑیاں توں نبھان کیتیاں

گلاباں جئے
کئیوں ؟
رنگ ترا پیلا ہو گیہ
وانگ سروں دے پھلاں
رنگ ترا پیلا ہو گیہ
نی گلاباں جئے نی

کئیں فکراں نے لالی تری کھو لئی
کناں جوبن ترا کھا لیا
دس نی گلاباں جئے
کئیوں ؟
رنگ ترا پیلا ہو گیہ

ترے بلاں تے ہاسے سیگے ٹیکدے
اوناں کیدیاں نظراں نیں لگیہ
تے رنگ ترا پیلا ہو گیہ
وانگ سروں دے پھلاں
رنگ ترا پیلا ہو گیہ

جوبن رتے روگ کہڑا پالیا
وانگ جوگیہ دے حال کیہ بنا لیا
مینوں بھلدا نئیں ترا ملوک جیہا چہرا
او تینوں روگ لگا کہڑا
نی رنگ ترا پیلا ہو گیہ

وانگ سروں دے پھلاں
نی رنگ ترا پیلا ہو گیہ

جوت

اک دور لمیری جوت مینوں پئی دسدی
کوہاں دے پینڈے تے جوت مینوں پئی دسدی
مری اکھ دے دیوے ٹمٹما گئے
مدتاں بعد مینوں روشن خیال جیۓ آ گئی
جدوں دی مینوں جوت دس پئی
نور اکھیوں چوں ورن لگیا
جئیو پیا چاہ جو سیگا مرن لگیا
جدوں مینوں جوت دس پئی
اے جوت حیاتی والی جوت اے
اے جوت نئیں اے موت دی وی موت اے
اساں نوں ایہو جوت چاہیدی
لمبے نیریاں توں ہن اسی اک گئے
ڈھڈے کھا کھا پدھریاں توں تھک گئے
اسی ڈگے تے منہ مٹیا چے رل گئے
خاکاں ملیاں نوں جوت ملدی

اس ماٹی میں ماگیوں جس ماٹی کا کھائے
کہے کبیرا داس جی ماٹی بیر نبھائے

ماٹی روندے کمہار کا ، ما جولاہا کاہے رندائے
ہو جولاہا تن کو ڈھانپو ، ننگ سہا نا جائے

بن کبیرا آنگن ایو ، اطلس داس کہلائے
ما کی کوئی بات نا،توری مایہ ما فریدا ، نانک جائے



تعارف

پروفیسر اطلس علی کا شمار ان تازہ دم لکھنے والوں میں ہوتا ہے جنہوں نے بہت کم عرصے میں اپنے منفرد لب و لہجے سے ادبی حلقوں کو متوجہ کیا ہے۔ ننکانہ صاحب کی مٹی سے جنم لینے والی اس تخلیقی روح نے تعلیم کے ساتھ ساتھ حرف و صوت کے رشتے کو بڑی خوبصورتی سے نبھایا ہے۔"

زیرِ نظر مجموعہ کلام " یا صاحبی السجن " محض لفظوں کا مجموعہ نہیں، بلکہ پروفیسر صاحب کے مشاہدات، احساسات اور ان کی داخلی کیفیات کا عکس ہے۔ ان کے ہاں روایت کا احترام بھی ہے اور جدید عہد کے مسائل کا ادراک بھی۔ یہ پہلی کتاب اس بات کی نوید ہے کہ اردو ادب کو ایک توانا اور مخلص آواز میسر آ رہی ہے۔"